اور مغز شعر تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، آخر میں ان کے غیر متداول کلام کا ایک انتخاب شامل کر دیا ہے، جس سے اس کی افادیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے، اس کتاب کے ذریعہ غالب اور ان کے اشعار کو سمجھنے کی کچھ نئی راہیں کھلتی ہیں۔

تذکرہ شاہ محمد غوثؒ - از پیام شاہجہانپوری، صفحات ۲۰۸، کتابت وطباعت بہتر، ناشر اشاعت منزل بل روڈ، لاہور ۷، قیمت سے ر

ہند و پاک میں اس نام کے دو بزرگ گذرے ہیں، ایک شاہ محمد غوث گوالیاری، دوسرے شاہ محمد غوث لاہوری، اول الذکر بزرگ کے حالات پروفیسر محمد مسعود صاحب نے مرتب کیے ہیں جس پر معارف میں تبصرہ ہو چکا ہے، دوسرے شاہ محمد غوث لاہوری کے حالات پیام شاہجہانپوری نے جمع کیے ہیں، وہ سلسلۂ شطاریہ کے بزرگ تھے، اور یہ سلسلہ قادریہ کی ایک اہم کڑی ہیں، شاہ محمد غوث لاہوری نے علوم درسی کی تکمیل کے بعد اپنے والد محترم سید حسن شاہ متوفی ۱۱۱۵ھ سے جو مرحد میں "سید حسن بادشاہ" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں بیعت کی اور پھر خلافت پائی، خلافت کے بعد انھوں نے تقریباً پورے ہندوستان کی سیاحت کی، اس سیاحت میں لاہور، دلی، سرہند، اجمیر اور گجرات کے تمام بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی، پھر واپس آکر مستقل طور پر لاہور میں قیام پذیر ہو گئے، اور برسوں اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا، باختلاف روایت وفات ۱۱۵۲ھ میں ہوئی، باطنی کمالات کے ساتھ ان کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق تھا، چنانچہ انھوں نے چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں تصنیف کیں جن میں اصول حدیث اور بخاری شریف کی شرح اور قرآن پاک کا فارسی ترجمہ بھی شامل ہے، مصنف نے بڑی محنت و تحقیق اور سلیقہ کے ساتھ شاہ صاحب کے حالات جمع کر دیے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کی تصانیف اور ان کی تعلیمات پر سیر حاصل بحث کی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مفید و مقبول ہوگی۔

م - ج

جلد ۹۶ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات

گذشتہ دو مہینوں میں مسلمانوں کے دو بڑے قومی حادثے ہوئے، ۵ر نومبر کو داؤدی بوہروں کے امام ملا طاہر سیف الدین نے انتقال کیا، ان کی ذات جامع صفات تھی، بڑے ذی علم، دیندار، فیاض و مخیر اور وسیع القلب تھے، دینی علوم پر انکی نگاہ بہت وسیع تھی، اس لحاظ سے وہ ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھے، صاحب قلم بھی تھے، عربی میں انکی کئی تصانیف ہیں، انھوں نے اپنے دور میں نہ صرف اپنے فرقہ کی بڑی تعلیمی و اقتصادی خدمت کی بلکہ دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ بھی انکا سلوک روادارانہ اور فیاضانہ تھا، اور ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی، مسلم یونیورسٹی کے تو چانسلر ہی تھے، اس کو وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں دیتے رہتے تھے، دار المصنفین کی جوبلی کے موقع پر اس کو بارہ ہزار کا عطیہ دیا، اس لیے ہر فرقہ کے مسلمانوں میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کے طفیل میں انکی مغفرت فرمائے، دار المصنفین اس حادثہ میں ان کے لائق جانشین ملا برہان الدین کا شریک غم ہے اور دعا ہے کہ خدا ان کو ان کے باعظمت والد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسرا حادثہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی وفات کا ہے، مرحوم مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ کے شاگرد رشید اور ہندوستان کے ممتاز عالم تھے، انکی پوری زندگی دینی علوم خصوصاً حدیث نبوی کی خدمت، اس کی تعلیم و تدریس اور اس سے متعلق تالیف و تصنیف میں گذری، مختلف اوقات میں دار العلوم دیوبند اور مدرسہ ڈابھیل کے مدرس رہے، کچھ دنوں تک ندوۃ المصنفین سے بھی تعلق رہا، پھر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، وہاں بھی درس و افاضہ کا سلسلہ جاری رہا، چند برسوں کے بعد دیار حبیب کی کشش مدینہ طیبہ کھینچ لے گئی اور دس بارہ سال تک جوار رسول میں حدیث رسول کی خدمت انجام دیتے رہے، اور بالآخر اسی آستانہ پر گذشتہ اکتوبر میں جان دی، سلوک و تصوف کا بھی وافر حصہ ملا تھا، ان کے دو بڑے علمی و دینی کارنامے ہیں، مولانا انور شاہؒ کے درس بخاری کی تقریروں کی جمع و تدوین جو فیض الباری کے

نام سے مصر سے چھپکر شائع ہو چکی ہے، اردو میں ترجمان السنۃ کی ضخیم جلدیں جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہیں، ان کی وفات سے ایک بڑی علمی و دینی شخصیت اٹھ گئی، اللہ تعالیٰ صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں حدیث و سنت کے اس خدمت گذار کی مغفرت فرمائے۔

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہتی ہیں، زمانہ کے تغیرات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، انہی میں "الناس علیٰ دین ملوکھم" بھی ہے، اس مقولہ میں دین سے مراد مذہب نہیں بلکہ خیالات و رجحانات اور طریقۂ زندگی ہے، البتہ اس زمانہ کے لحاظ سے ملوک کے بجائے حکومت کہا جائے گا۔ طریقۂ زندگی میں ایک اثر پذیری تو فطری ہے، جب دو قومیں یا دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملیں گی تو ان کا دوسرے سے متاثر ہونا طبعی اور ناگزیر ہے، جس طرح ایک زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہوئے، لیکن یہ دونوں تہذیبوں کا حسین اور فطری امتزاج تھا، دوسرا تاثر مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اسکی خوشنودی اور منصب وجاہ کی طلب کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کی مثال انگریزوں کے زمانہ کے "دیسی صاحب" اور حکومت کے مقرب و خطاب یافتہ ہندو مسلمان تھے، ہندو مسلمان فطری طور پر ایک دوسرے کی تہذیب سے جتنا متاثر ہونا تھا، ایک ہزار سال میں ہو چکے، اب مسلمانوں کی مزید اثر پذیری، ان کی مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوشنودی اور منصب و جاہ کی طلب کا نتیجہ ہے، یہ اثر پذیری ان مسلمانوں میں زیادہ ہے جو حکومت سے وابستہ اور اس کے فوائد اور مناصب کے طالب ہیں، اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، اس کا اندازہ ہر شخص کو ہوگا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا، اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اپنی سیکولرازم اور حکومت و اکثریت کی وفاداری کے ثبوت اور انکی خوشنودی کے جنون میں ایسی ایسی خفیف حرکتیں کرتا ہے جس کا کوئی خوددار انسان تصور نہیں کر سکتا، اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے گھبراتا ہے، سیکولرازم کے پردہ میں اسلامی تہذیب و روایات کی مخالفت کرتا ہے، مسلمانوں کو فرقہ پروری کا مجرم ٹھہراتا ہے، ان کے خلاف جاسوسی تک کرتا ہے، اس کی نگاہ میں پرانے نیشنلسٹ مسلمان بھی جن میں

قوم پروری کے ساتھ ملی احساس بھی ہے، فرقہ پرور ہیں، چنانچہ وہ ان کٹر نیشلسٹ مسلمانوں کو بھی جو کسی فرقہ وارانہ یا اسلامی جذبہ کے ماتحت نہیں بلکہ خالص جمہوری اور سکولر نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف چاہتے ہیں، نہیں بخشتا، کسی کی زبان پر مسلمان کا نام آیا اور اس نے فرقہ پروری کا لیبل لگا دیا، اور پاکستانی ایجنٹ کا خطاب دیدیا، ایک خالص اور پرانے نیشنلسٹ اخبار تک کو ان محتاط الفاظ میں اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

"بعض سیاسی جماعتوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں کوئی مطالبہ ایسا کیا جس کا تعلق صرف مسلمان فرقے سے ہے، وہ جماعتیں شور مچانے لگتی ہیں کہ مطالبہ اپنی اسپرٹ میں پاکستانی ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ساتھ نہیں ہیں، پاکستان کے ساتھ ہیں، خیر یہ تو فرقہ پرور جماعتیں ایسا کہیں تو کہیں، ان کا تو کام ہی یہ ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جو ہندو فرقہ پرور جماعتوں کی تحریکوں اور پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی ان باتوں کو انہی کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔" (قومی آواز ۹ رنومبر ۶۵ء)

معزز معاصر نے مسلمانوں کے اس نوپیدا طبقہ کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن اس کا جو سبب بتایا ہے وہ محض اس کی احتیاط ہے، ورنہ اس کا اصلی سبب وہ بھی جانتا ہے، درحقیقت یہ سب "الناس علیٰ دین ملوکھم" کا نتیجہ ہے، اور سکولرازم کے نام پر کیا جاتا ہے، اس لیے اگر ایسے مسلمانوں کو حکومت اور اکثریت کا خوشامدی نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے، محض سکولرازم پر عقیدہ رکھنے والے مسلمان اس میں شامل نہیں ہیں، لیکن حقیقۃً یہ جمہوریت اور سکولرازم کی کوئی خدمت نہیں ہے، صحیح جمہوریت اور سکولرازم یہ ہے کہ ہر فرقہ کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، اس کی خصوصیات کے ساتھ اس کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے، سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش سکولرازم اور جمہوریت نہیں بلکہ استبداد کی بدترین قسم ہے، اس لیے جو لوگ ایسا کرتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان سکولرازم اور جمہوریت کے دشمن ہیں، ممکن ہے ان سکولر مسلمانوں کو حکومت سے کچھ فوائد حاصل ہو جائیں لیکن انکی نگاہ میں انکی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ اکثریت کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔

مقالات

عالمگیر اور اس کے معاصر مشائخ [عہ]

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

شاہ جہاں نے اپنے عہد میں دین اور مذہب کی ترویج کر کے اپنی سلطنت میں اسلامی فضا قائم کرنے کی کوشش کی جس کی بین شہادتیں دہلی کی جامع مسجد، آگرہ کی موتی مسجد، اور اسکی بنائی ہوئی دوسری مسجدیں بھی ہیں، اس نے اپنے شہزادوں کو بھی پوری مذہبی تعلیم دلائی، دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد، سب ہی اپنے زمانہ کے جید علماء و فضلاء سے تعلیم پاتے رہے، ان میں اورنگ زیب نے معقولات و منقولات کی تعلیم میر محمد ہاشم سے پائی،[۱] کلام پاک کا درس ملا موہن (ساکن بہار شریف) سے لیا،[۲] امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم مولانا سید محمد قنوجی سے پڑھیں[۳] تفسیر کا درس ملا جیون سے لیتا رہا،[۴] فقہی جزئیات کو شیخ عبدالقوی برہان پوری سے سمجھا،[۵] ملا شفیعائی دانشمند خاں سے بادشاہت کے زمانہ میں بھی خاص خاص کتابیں پڑھا کرتا تھا، اس کو دینی علوم سے فطری رغبت تھی،

عہ اپریل ۱۹۶۵ء میں یوم عالمگیر کراچی میں منایا گیا، یہ مقالہ اسی موقع کے لیے جناب ڈاکٹر معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی فرمایش پر لکھا گیا،

۱ بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ج ۱ ص ۲۶۷ ۲ مآثر الکرام ص ۲۴۳ ۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۳ ۴ مآثر الکرام ص ۲۱۶-۲۱۷ ۵ مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۲۶-۲۲۵

لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھ گیا، امام غزالی کی تصانیف شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے مکتوبات اور شیخ محی الدین شیرازی کے رسائل اس کے مطالعہ میں برابر رہے۔[1]

اس نے کلام پاک حفظ کیا تو قرآنی علوم سے بھی اس کی دلچسپی بڑھی، بادشاہت کے زمانے میں جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا کام شروع کرایا تو اس کو شیخ نظام برہان پوری، ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپامئو، شیخ رضی الدین بھاگلپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری، سید نظام الدین ٹھٹھوی اور ملا غلام محمد لاہوری وغیرہ جیسے علما اور فقہا کی صحبت رہی جس کی وجہ سے وہ اور بھی حامی دین اور پابند شریعت ہوتا گیا، اسی لیے وہ شروع ہی سے ایسے مشائخ کا بھی قدر دان رہا جو ہر حال میں شریعت اور اسلامی شعار کے پابند تھے۔

جب وہ دکن کا صوبیدار تھا، تو اس زمانہ میں حضرت عبد اللطیف برہانپوری ایک مشہور بزرگ تھے، شریعت کے بڑے پابند ہونے کی وجہ سے نغمہ و سرود، غنا اور آلات غنا کو ناپسند کرتے تھے، شادی بیاہ کے موقع پر کوئی جلوس ان کی خانقاہ کے پاس گاتا بجاتا گزر نہیں سکتا تھا، دوسرے بزرگ انکے متعلق کہتے کہ ہم کو شکر گذار ہونا چاہیے کہ ایسے متشرع اور حق پرست بزرگ ہم میں موجود ہیں، اورنگ زیب ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کی خدمت میں خانقاہ کے مصارف کے لیے کچھ گاؤں پیش کرنا چاہا، تو انھوں نے یہ شعر پڑھ کر لینے سے انکار کیا۔

شاہ ما را دہ دہد منت نہد　　　رازق ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب اس شعر کو سن کر متاثر ہوا، لیکن اس نے عرض کیا کہ ہم فقرا، اور اولیا، اللہ کی خدمت خیر دنیوی اور برکت اخروی کے لیے کرتے ہیں، گاؤں پیش کرکے احسان کرنا مقصود نہیں، حضرت عبد اللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے تو رعایا سے نصف غلہ لو الملکہ محنت کشوں

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۰۰ اردو

اور مظلوموں کے پاس اور بھی زیادہ چھوڑ دو، گوشہ نشینوں اور متوکلوں کے لیے وظائف مقرر کرو، مظلوموں کی داد رسی اس طرح کرو کہ ان کی حق تلفی نہ ہو اور ظالموں کے ہاتھ مظلوموں کے لیے کوتاہ ہوجاتے ہیں۔ وغیرہ، اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا، اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے اپنے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

اورنگ زیب کو ان کے آخر وقت تک ان سے عقیدت رہی، منتخب اللباب میں ہے:

"خلد مکاں را در خدمت ایشاں ارادت و حسن عقیدت تمام بود، و ہیچ ماہ و ہفتہ نہ بود کہ فرمان لطف آمیز بہ دستخط خاص بنام ایشان صادر نشود۔" (ج ۲ ص ۵۹۶)

شیخ عبد اللطیف برہانپوری کے ایک خاص مرید ملا قطب ہانسی ملتان کے رہنے والے تھے، وہ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ میں برہانپور میں اس سے ملے تھے، تو اورنگ زیب اسی وقت سے ان کا قدر دان ہوگیا، اور جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے ملا صاحب کی خدمت میں چار لاکھ درہم پیش کیے اور ایک گاؤں بھی ان کے نام سے موسوم کیا جس کا نام قطب آباد رکھا گیا۔[2]

برہان پور میں ایک دوسرے بزرگ شیخ برہان تھے، جو مریدوں کی تربیت کرنے میں بہت سختی کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں کچھ ایسے مرید بھی جمع ہوجاتے جو ان کے عقیدت و محبت میں عالم سکر میں ان کو خدا کہہ دیتے، شیخ برہان اس کو پسند نہ کرتے، اور جب وہ باز نہ آتے تو ان کو سزا کے طور پر قید کردیتے، اگر ان کے مریدین شریعت کی خلاف ورزی کرتے اور ان کی نصیحت قبول نہ کرتے تو ان کو شہر کے قاضی کے حوالے کردیتے، جو ان کو قید کردیتا، پھر بھی وہ باز نہ آتے تو قاضی ان کو قتل کردیتا،

[1] رقعات عالمگیری شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ، نمبر ۲۲، مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۳۲، منتخب اللباب از خافی خان حصہ دوم ص ۵۶-۵۵۵، بزم تیموریہ ص ۲۵۳ [2] مراۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۳۰۱، بزم تیموریہ ص ۲۴۵

اورنگ زیب جنگ جانشینی کے لیے دکن سے روانہ ہوا تو وہ حضرت شیخ برہان کی خدمت میں برہانپور حاضر ہوا، شیخ برہان ہندو مسلمان سے بے تکلف ملا کرتے تھے، ان کے لیے ان کی خانقاہ کا دروازہ کھلا رہتا لیکن وہ بادشاہ اور امراء سے ملنا اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، ایک نووارد کو دیکھ شیخ برہان نے نام پوچھا، اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے، اور جب عام لوگوں کو تبرک دینے لگے تو اورنگ زیب کو کچھ نہ دیا، لیکن اورنگ زیب اس سے بددل نہ ہوا، دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا، شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے تو لے لو، ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے، اورنگ زیب اس سے بھی دل گیر نہ ہوا، تیسرے دن پھر وہ ان کے پاس گیا، شیخ برہان نماز کے لیے خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے کہ اورنگ زیب مؤدبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے، اگر مجھکو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کرونگا، آپ باطنی توجہ فرمائیں، یہ سن کر شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے، تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، اور رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو، ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اس سے کہا بادشاہی مبارک ہو[1]

اور جب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس کو اپنی شریعت نوازی کے سبب قدم قدم پر ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، ان ہی میں دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت کے بھی واقعات ہیں، یہاں پر حضرت سرمد کے ساتھ دارا شکوہ کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ بھی شیخ وقت ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے مرشد ملا جیوا اپنے مریدوں کو اسی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے،

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۴، نیز دیکھو بزم تیموریہ ص ۲۵۴

اور وہ ان سے کہتے تھے کہ اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے تو خدا سے پھر جاؤ گے (حسنات العارفین از دارا شکوہ ص ۴۲)۔ اور وہ خود بھی اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے، جہاں اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہنچتا ہے، میں بغیر ریاضت کے یکبارگی پہنچ گیا، اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا (ص ۵) پھر اس کی زبان سے کچھ ایسے کلمات نکلنے لگے جن کو سنکر علماء آزردہ خاطر ہوئے، لیکن وہ خود اپنی مدافعت میں حسنات العارفین کی تمہید میں لکھتا ہے کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب ایک سالک شریعت و طریقت کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بےخودی میں اسکی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں، لیکن وہ قابل مؤاخذہ نہیں ہو (دیکھو تمہید حسنات العارفین از دارا شکوہ) لیکن دارا شکوہ کی اس تاویل سے علمائے ظواہر مطمئن نہیں تھے، پھر اس نے مجمع البحرین لکھکر اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتانے اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی، اور یہ بھی بتایا کہ اسلامی تصوف اور ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، علمائے ظواہر نے دارا شکوہ کے ان خیالات کو مطلق پسند نہیں کیا، اور جب اس نے اپنشد کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی تمہید میں اس کا بیان ہے کہ اس کو علم توحید توریت، انجیل اور زبور کے مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ ان میں توحید کا بیان مجمل ہے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی تسلی قرآن پاک سے بھی نہ ہو سکی، کیونکہ اس کی اکثر باتیں رمز کی ہیں، آخر اس کو توحید کی تمام باتیں اپنشد میں مل گئیں، جس کے پچاس ابواب کا ترجمہ اس نے سنسکرت سے فارسی میں کر کے عام کیا، وہ رفتہ رفتہ توحید وجودی کا قائل ہو کر بھگوت گیتا، بششٹ اور رام چندر جی کا بھی معترف ہو گیا، اور دیر و حرم کی تفریق مٹانی چاہی جو ظاہر ہے کہ

اسلام کے راسخ العقیدہ علماء وفقہاء اور صوفیہ کو پسند نہ آیا، عالمگیر نے جب دھرماوت اور سموگڑھ کے محاذ پر دارا کو شکست دیدی تو پھر اس کو شریعت کے محاذ پر لاکر اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں کیا رکاوٹ پیدا ہوسکتی تھی، جبکہ راسخ العقیدہ علماء اور فقہاء اس کو مرتد اور ملحد سمجھتے تھے، آجکل کے مورخین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس کی رواداری اور وسیع المشربی سے متاثر ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر داراشکوہ تخت نشین ہوتا تو مسلمانوں کی حکومت برابر قائم رہتی، لیکن اورنگ زیب کے حامی یہ کہتے ہیں کہ داراشکوہ کے تخت نشین ہونے سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام باقی نہ رہتا، اورنگ زیب کی تخت نشینی سے اس کے بعد گو مسلمانوں کی حکومت کچھ دنوں کے بعد باقی نہیں رہی لیکن ہندوستان میں اسلام باقی رہا،

حضرت سرمد کا معاملہ داراشکوہ سے کچھ مختلف تھا، وہ بھی داراشکوہ کی طرح ایسی ہی توحید وجودی کے قائل تھے جس کو علماء اور شریعت نواز صوفیہ پسند نہ کرتے تھے، وہ داراشکوہ کے حامی رہے، انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ شاہجہاں کے بعد وہی بادشاہ ہوگا، لیکن جب وہ پسپا ہوکر قتل کردیا گیا تو عالمگیر نے حضرت سرمد سے دریافت کیا کہ انھوں نے داراشکوہ کو بادشاہت کی جو خوشخبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہوسکی حضرت سرمد نے جواب دیا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا کیونکہ داراشکوہ کو ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ تاویل اورنگزیب کو ناگوار گزری ہوگی لیکن ان پر اور بھی الزامات تھے، کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، اور برہنہ رہا کرتے ہیں، حکومت کے قاضی عبدالقوی نے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے جواب دیا: کہ شیطان قوی است۔ اس کو قاضی عبدالقوی اپنے اوپر طنز سمجھے، انھوں نے ان پر عریانی کا جرم قائم کرکے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا لیکن عالمگیر نے اس کو یہ کہکر رد کیا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہوسکتی، ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جز یعنی لا الٰہ

پڑھتے ہیں، اس امتحان کے لیے شاہی دربار میں علماء کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سرمد بھی طلب کیے گئے، ان سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا گیا، تو انھوں نے حسب عادت صرف ایک جز یعنی لا الٰہ پڑھا، علما نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر نہیں پہنچا ہوں، تو پھر جھوٹ کیسے کہوں، علماء نے کہا، ایسا کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا گیا۔ حضرت سرمد کی قبر اب بھی مرجع خواص و عوام ہے، انھوں نے محبت الٰہی، دیدار الٰہی اور دیدار نبوی پر جو رباعیاں کہی ہیں وہ آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن وہ ترک شریعت کی وجہ سے قانون شریعت کی زد میں آگئے،

داراشکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت میں مورخین سیاسی مصالح بھی شامل کرتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی زمانہ میں توحید وجودی کی جو موشگافیاں ہوئیں، ان سے طرح طرح کے فتنے اٹھتے گئے، جس کی آڑ میں شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کیا جانے لگا، شریعت کو حقیقت کا چھلکا بتایا گیا، انا الحق کا نعرہ بلند ہونے لگا، حسینوں کی صحبت میں رسائی حق کی راہ تلاش کی جانے لگی، سادہ رخوں میں اللہ ہی کا رنگ دیکھا جانے لگا، حسینوں کے غمزہ و ادا اور عشوؤں کو ... مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا جانے لگا، راسخ العقیدہ صوفیہ ان تمام باتوں کو بدعت، گمراہی اور ضلالت قرار دیتے، وہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنے والے کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے، جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ بھی کہنے کے قائل نہ ہوتے، وہ توحید اور رسالت دونوں پر یقین کامل رکھنے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی سلامتی سمجھتے اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو، اس متابعت کے ذریعہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ

کی قربت حاصل ہونا ممکن ہے، وہ انا الحق کے کہنے والوں کو مرتد اور بے دین سمجھتے، اسی لیے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے اور سلاطین وقت سے مل کر ان کو قتل کرا دیتے۔

توحید کے اس قسم کے پرستاروں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی نے جو آواز اٹھائی تھی، وہ برابر گونجتی رہی، خود ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ معصوم سرہندی جو ان کے علوم و معارف کے بہت بڑے شارح تھے، بلکہ ان کے نقش قدم پر چل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کر کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تجدید اور اصلاح میں لگے تھے۔ ان کی تعلیم بھی کہ سنت کا اتباع اور بدعت سے اجتناب کرنا، ہر حال میں دامن متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تھامنا اور آثار صحابہ پر چلنا ضروری ہے، اور اپنے تمام مریدوں اور متوسلوں کے خطوط میں اسی کی تربیت دیتے رہے، مثلاً اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اے بھائی! ناجنس اور مخالف طریق کی صحبت سے بچتے رہنا، اور بدعتی کی مجلس سے گریزاں رہنا، یحییٰ معاذ رازی قدس سرہٗ کا مقولہ ہے کہ ان تین اصناف سے اجتناب کرو، (۱) علمائے غافلین (۲) قرائے مداہنین (۳) متصوفہ جاہلین۔ جو شخص شیخوخت کی مسند پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کا عمل موافق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے، اور نہ وہ خود زیور شریعت سے آراستہ ہے، خبردار، خبردار اس سے دور رہنا، بلکہ احتیاطاً اس شہر میں بھی نہ رہنا۔ ..... سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں، کامیابی کے تمام راستے بند ہیں، سوائے اس شخص کے راستے کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم کی پیروی کرے ..... آداب نبوی کا خیال نہ رکھنے والے اور سنن مصطفوی کو چھوڑ دینے والے کو ہرگز ہرگز عارف خیال نہ کرنا، اس کے ظاہری تبتل و انقطاع، خوارق عادات

زہد و توکل اور زبانی معارف توحیدی پر فریفتہ و شیفتہ نہ ہو جانا .... مدار کار اتباع شریعت پر ہے، اور معاملۂ نجات پیروی نقش قدم رسول سے مربوط ہے، محق و مبطل میں امتیاز پیدا کرنے والی چیز اتباع پیغمبر ہی ہے، زہد و توکل اور تبتل بغیر اتباع رسول کے نامعتبر ہیں، اذکار و افکار اور اشواق و اذواق بے توسل سرکار دو عالم غیر مفید ہیں۔ .... حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا جس نے آداب سے سستی برتی، وہ سنن سے محروم ہو گیا جس نے سنن سے غفلت اختیار کی وہ فرائض سے محروم ہوا، اور جس نے فرائض سے تہاون کیا وہ معرفت سے محروم ہو گیا، شیخ ابو سعید ابو الخیر سے لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے، انھوں نے فرمایا ہاں گھانس کا تنکا بھی پانی پر چلتا ہے، پھر کہا گیا کہ فلاں آدمی ہوا میں اڑتا ہے، فرمایا چیل اور کوا بھی ہوا میں اڑتے ہیں، پھر کہا گیا کہ فلاں آدمی ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں چلا جاتا ہے، فرمایا شیطان تو ایک دم میں مشرق سے مغرب تک چلا جاتا ہے، ان باتوں کی کوئی قیمت نہیں، مرد حق در اصل وہ ہے جو مخلوق کے درمیان نشست و برخاست رکھے، بیوی بچے رکھتا ہو، اور پھر ایک لحظہ خدائے عز و جل سے غافل نہ رہے، شیخ علی ابن ابی بکر قدس سرہٗ نے معارج الہدایہ میں فرمایا ہے کہ ہر انسان کا حسن و کمال تمام امور میں ظاہراً و باطناً و اصولاً و فروعاً عقلاً و فعلاً، عادۃً و عبادۃً کامل اتباع رسول میں مضمر ہے۔"

(مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہی ص ۹۳-۹۲)

اورنگ زیب کا فطری اور ذہنی رجحان ان ہی تعلیمات کی طرف تھا، اس لیے وہ حضرت خواجہ معصوم سرہندی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا، تیموری خاندان جہانگیر ہی کے زمانے سے حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر تھا، جہانگیر پہلے تو حضرت مجدد الف ثانی کا مخالف رہا

لیکن پھر ان سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی صحبت میں دیکھنا چاہتا تھا[1]۔ اور شہزادہ خرم کو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل کر دیا تھا[2]، عالمگیر نے خواجہ معصومؒ سے بیعت کر کے نہ صرف اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھا، بلکہ ان سے تعلیم پا کر اپنی ایمانی و روحانی بصیرت میں جلا بھی پائی، اور حضرت خواجہ معصومؒ کو بھی تخت و تاج کے ایک مالک کی ذات میں وہ تمام باتیں ملتی گئیں جن سے ان کو دین و مذہب کے احکام کی اصلاحی تبلیغ میں ہر طرح کی مدد ملتی رہی، اسی لیے وہ عالمگیر کی مذہبی اور روحانی تلقین و تربیت میں برابر مشغول رہے۔

ایک بار ایک مکتوب میں حضرت خواجہ معصوم نے عالمگیر کو یہ حدیث لکھکر بھیجی کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت کب آئے گی، فرمایا تجھ پر افسوس تو نے قیامت کی تیاری کیا کی ہے (جو قیامت کو دریافت کر رہا ہے) اس نے کہا میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی ہے، مگر اللہ اور اس کے رسول کو محبوب رکھتا ہوں، ارشاد ہوا تو تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرتا ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے اس ارشاد سے صحابۂ کرام کو اتنی مسرت ہوئی کہ میں نے اسلام کے علاوہ کسی چیز سے اتنی مسرت نہیں دیکھی، یہ حدیث لکھکر حضرت خواجہ معصومؒ عالمگیر کو حب رسول کی تعلیم دے رہے تھے، جو عالمگیر میں پہلے سے موجود تھی، اس میں اور جلا پیدا ہوتی گئی، حضرت خواجہ معصوم کا یہ مکتوب عالمگیر کے کسی خط کے جواب میں تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے ان سے اپنے قلب کی بعض روحانی کیفیات کا بھی اظہار کیا تھا، اور اس کا مداوا چاہتا تھا، شاید عالمگیر پر گریۂ دل طاری رہتا تھا، اسکے جواب میں حضرت خواجہ معصومؒ لکھتے ہیں کہ

"اس مکتوب سے راہ طریقت کا شوق ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مقصد کے حاصل ہونے

[1] دیکھو مکتوبات امام ربانی دفتر سوم نمبر ۳۴ [2] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۱۳

کی امید ہے، ایک درویش نے لکھا ہے کہ اگر نخواستے داد، نداد ے خواست" یعنی اگر اللہ تعالیٰ کچھ دینا نہ چاہتا تو طلب کا مادہ ہی پیدا نہ کرتا، صوفیہ کا یہ مقولہ ہے کہ جب قلب گمشدگی سے روتا ہے تو روح یافت پر خوش ہوتی ہے، اس مقولہ کی رو سے گریۂ دل کو جو کہ از راہ طلب و شوق پیدا ہوا ہے، یافت روح پر دلیل قرار دیا گیا ہے، یعنی گریۂ دل ہی سے روحانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

اور پھر اس کی وضاحت صوفیانہ اور عارفانہ انداز میں اس طرح کی ہے:

"لطائف خمسۂ عالم آپس میں پڑوسیوں کا حکم رکھتے ہیں، ان میں بعض لطائف ایک دوسرے سے زیادہ لطیف ہیں، اور جو بھی لطیف تر ہے، عالم غیب سے نزدیک تر ہے، اور حضرت وہاب سے فیوض حاصل کرنے میں آگے بڑھا ہوا ہے، جب کبھی ان لطائف میں سے کسی لطیفہ پر کوئی عطیہ وارد ہوتا ہے تو دوسرا لطیفہ جو اس سے قریب ہے، خبردار ہو جاتا ہے، اور اس دولت پر رشک کرتا ہے، اس کی طلب میں کوشش کرتا ہے اور اس کو گریۂ شوق دامن گیر ہو جاتا ہے، اور اگر کسی لطیفہ پر وارد غیبی نمودار نہیں ہوتا ہے تو تمام لطائف غافل رہتے ہیں، اور راہ طلب بند ہو جاتی ہے، پس گریۂ قلب دلیل ہے اس امر کی کہ روح کو کچھ مل گیا، اس لیے کہ قلب و روح کو آپس میں نسبت ہمسائگی اور اتصال حاصل ہے، ایک کی یافت سے دوسرا واقف ہے، اور اس دولت کے نہ پانے سے نالاں اور اس کی طلب میں دواں ہے۔"

اسی خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معصومؒ نے اپنے ایک صاحبزادے شیخ سیف الدین کو عالمگیر کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کے لیے اس کے پاس بھیج دیا تھا، شیخ سیف الدین اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح کمالات صوری و معنوی کے حامل ہو گئے تھے، عالمگیر ان کو بہت محبوب

اور مقرب رکھنے لگا تھا، اور جب اس نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال حضرت خواجہ معصوم کو لکھ بھیجا
تو وہ مذکورہ بالا مکتوب ہی میں تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ والمنۃ کہ فقیرزادہ (شیخ سیف الدین) منظور نظر قبول ہو گیا ہے، اور اسکی
صحبت موثر ثابت ہوئی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو کہ فقیرزادے کا شیوہ ہے، اس کا
آپ نے اظہار شکر و رضامندی کیا ہے، اس اظہار شکر پر شکر خداوندی بجالایا، اور
اس سے میری دعاگوئی اور بھی بڑھ گئی ہے، کیا عجیب نعمت ہے کہ اس طمطراق بادشاہت
اور دبدبۂ سلطنت کے ہوتے کلمۂ حق سمع قبول میں آئے، اور ایک نامراد کا قول موثر ثابت ہو"

اور آخر میں کلام پاک کی ایک آیت لکھ کر اپنے مکتوب کو ختم کرتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں
کہ مژدہ دیدیجئے میرے ان بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور نیکوترین بات کی پیروی
کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے، اور یہ لوگ صاحبان عقل
وخرد ہیں۔ (مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہی ص ۲۸۱-۸۳)

ایک دوسرے مکتوب میں عالمگیر کو پہلے محبت الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز
باطل یعنی بے حقیقت اور فانی ہے، پھر لکھتے ہیں کہ ایک باطل ہیچ و پوچ ہوتا ہے اور ایک عدم ہے جو وجود سا ہے، ہر چیز کی
ذات عدم ہے اور عدم ہر شر و نقص کا مادہ و ملجا ہے، کسی چیز میں صفات کمال کا پایا جانا مرتبۂ وجوب
سے مستعار ہے، پس خیر و کمال کا مرجع خداوند تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، جو واجب ہے، اور
اور شر و نقص تمامتر ممکن کی طرف راجع ہیں، اسی لیے کلام پاک میں کہا گیا ہے کہ جو بھی بھلائی کسی کو
پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جو برائی کسی کو پہنچتی ہے وہ خود اس کی ذات
سے ہوتی ہے، اور جو کوئی اپنی نادانی سے اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے، اور اپنے عارضی
کمالات کو کامل خیال کر کے اپنے کو مبداء احسانات سمجھتا ہے، وہ گویا مولائے حقیقی سے ہمسری کا

دعویٰ کرتا ہے، اور اس میں رعونت اور انانیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن جو کوئی اپنے صفات کمال
کو حق تعالیٰ کے کمالات کا پرتو سمجھتا ہے اور ان عارضی کمالات کو بالکلیہ اصل کے حوالہ کرتا ہے اور
اپنے آپ کو جو کہ آئینۂ کمالات ربانی ہے، محض خالی سمجھتا ہے، اور معدوم محض دیکھتا ہے تب وہ
فنائے حقیقی سے مشرف ہوتا ہے، اور انانیت امارہ سے چھٹکارا پاتا ہے، پھر نفس امارہ تدریجاً نفس مطمئنہ
بنتا ہے، اسی وقت نعمت حق اس کے حق میں کامل ہوتی ہے۔

یہ گویا عالمگیر کو نصیحت تھی کہ کسی حال میں بھی وہ اپنے میں انانیت نہ پیدا ہونے دے، عالمگیر
نے حضرت خواجہ معصوم سے بار گرانبار جہانداری اور اپنے حسن خاتمہ کے لیے دعا کرنے کی درخواست
کی تھی جس پر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اس کے لیے پوری ہمت کے ساتھ برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں
اور پھر اس کو یہ لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے آپ کو اس بارہ میں خوف عنایت فرمایا ہے،
اس لیے بہت کچھ امیدیں ہیں، یہ خوف کارہائے مشکل کو آسان کر دیتا ہے، کیونکہ
حدیث میں آیا ہے کہ خوف دنیا اور خوف آخرت کسی شخص واحد کے اندر جمع نہیں ہوتے،
یعنی اگر کسی کے اندر خوف آخرت ہوگا تو خوف دنیا سے محفوظ رہے گا۔"

عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم کے صاحبزادے شیخ سیف الدین کی پھر تعریف لکھی تھی،
اس پر حضرت خواجہ معصوم بھی پھر تحریر فرماتے ہیں:

"فقیرزادے کی ادائیگی خدمت اور لوازم خیرخواہی آپ کی نظر میں پسندیدہ ہیں
یہ بات اس کے لیے موجب سعادت و باعث امتیاز ہوئی، فقیرزادہ جو کہ صاحب کمالات
صوری و معنوی ہے، عزلت اور عدم اختلاط کی عادت رکھتا تھا، چند آدمیوں میں
بیٹھنے کی بھی اس کو عادت نہ تھی، لیکن محض خیرخواہی نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے،

کہ آپ کے پاس گیا ہے"

پھر اپنے صاحبزادے کے توسل کو محض عنایاتِ ربانی کا ایک سبب بتاتے ہیں، اس لیے اورنگ زیب کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں:

"مربی حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، وہ خود درد طلب دیتا ہے، اور اپنی طلب میں دوڑاتا ہے اور خود راہ وصل کھولتا ہے، ع

از ما و شما بہانہ بر ساختہ اند

اسی مکتوب میں عالمگیر کے خط کی تحریر کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے ایک عربی شعر بھی لکھتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ہر ہر لفظ میں آرزوؤں کا ایک باغ مضمر ہے اور ہر ہر سطر میں موتیوں کا ایک ہار پنہاں ہے،

"آپ کے مکتوب کے فصاحت رنگین اور بلاغت معانی و ادب کا کیا بیان کروں

ففی کل لفظ منہ روض من المنیٰ وفی کل سطر منہ عقد من الدرر

ایک اور مکتوب میں عالمگیر کے خط کے قلم کو عنبریں رقم کہہ کر نوازا ہے، (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی، ص ۸۶-۸۳-۲۸۲)

حضرت خواجہ معصومؒ کے صاحبزادے شیخ سیف الدین بھی عالمگیر کی باطنی کیفیات سے اپنے والد ماجد کو برابر مطلع کرتے رہتے، ایک بار عالمگیر کے "اثرات ذکر و لطائف" "قلت خطرات" "قبول کلمۂ حق" "رفع بعض منکرات" اور "ظہور لوازم طلب" کے متعلق لکھ کر بھیجا تو حضرت خواجہ نے شکر خدا ادا کیا، کیونکہ اس قسم کی باتیں سلاطین میں نہیں پائی جاتی ہیں، اور پھر یہ حدیث لکھی کہ جو سنت کو مردہ ہونے کی صورت میں زندہ کرتا ہے، اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے، یہ گویا اپنی طرف سے عالمگیر کو سو شہیدوں کے ثواب کی بشارت دے رہے تھے، اور آخر میں

دعا کرتے ہوئے لکھتے ہیں (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۸۱-۲۸۰):

"بادشاہ کی ظاہری و باطنی صلاحیت کا خواستگار ہوں، ان کے باطن کو نسبت اکابر سے معمور پاتا ہوں، اور امیدوار ہوں کہ وہ جلد ہی فنائے قلب کی دولت سے مشرف ہو جائیں گے، یہ فنائے قلب درجات ولایت میں درجۂ اولیٰ ہے۔ ع

با کریماں کارہا دشوار نیست

شیخ سیف الدین نے ایک دوسرے مکتوب میں اپنے والد ماجد کو عالمگیر کی نجی مجلسوں کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجالس سلطانی میں عجیب اسرار جلوہ گر ہوتے ہیں، جو نہی ان کی محفلوں میں داخلہ ہوتا ہے، "عروج و نزول" کی کیفیات کے ساتھ ممتاز کر دیا جاتا ہے، اس کو پڑھ کر حضرت خواجہ معصومؒ نے تحریر فرمایا:

"ٹھیک ہے، اہل کمال ہر قطعۂ زمین سے وہ فیوض و اسرار جو اس کے مناسب حال ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، اور ہر زمین سے اس زمین کے مناسب کمال کو حاصل کرتے ہیں، کسی زمین کو معاملات فنا کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے، اور کسی کو کمالات لقا کے ساتھ موافقت ہوتی ہے، کسی قطعہ کو عروج سے مناسبت ہے اور کسی کو نزول سے، حرم مکہ کے کمالات و معاملات جدا ہیں، حرم مدینہ کے فیوض دکاروبار جدا۔ ع

ہر خوش پسرے را حرکات دگر ست

اسی مکتوب میں حضرت خواجہ لکھتے ہیں:

"تم نے بادشاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے اندر وسعت لطیفۂ اخفیٰ اور اس سے مناسبت تامہ کا پتہ چلتا ہے، اس بات کے مطالعہ سے

خوشی ہوئی، لطیفۂ اخفی سب سے بڑا لطیفہ ہے، اور اس کی ولایت سب ولایات سے اونچی ہے، اس لطیفہ کو خاص سرورکائنات کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے فقیر بھی بادشاہ کے اندر لطیفہ اخفی کی مناسبت پاتا ہے، والغیب عنداللہ"۔

(مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۸۹-۲۸۸)

ظاہر ہے کہ یہ خطوط بہت ہی نجی تھے، جن کو لکھتے وقت کبھی کاتب کو خیال نہ آیا ہوگا کہ یہ طبع ہوکر عام لوگوں کے ہاتھوں میں بھی پہنچیں گے اسلیے ان میں کسی مصلحت یا ذاتی منفعت کی جھلک نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ امرواقعہ کا اظہار ہے، اس لیے ان خطوط کو پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عالمگیر نے شریعت کی پابندی کرکے راہ سلوک کی بہت سی اعلیٰ منزلیں بھی طے کرنے میں لگا ہوا تھا، اسی لیے وہ اپنی بادشاہت کے زمانے میں کسی ایسے صوفی کی طرف مائل نہ ہوا جو "احوال و مواجید" اور "کشوف و الہامات" کے قائل تھے، اور بدعتوں میں مبتلا ہوکر ترک امر معروف کرتے اور سنت کے متبع نہ ہوتے، بلکہ جو صوفیہ کرام شریعت کے پابند ہوتے وہ ان کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتا، ان کے پاس بے تکلف جاتا، انکی نصیحتیں سنتا، بلکہ ان کی جھڑکیاں بھی برداشت کرتا۔

برہان پور کے ایک بزرگ شیخ نصیرالدین ہردی تھے، وہ اپنی جوانی میں دونوں پاؤں اور بائیں ہاتھ سے مجبور ہوگئے تھے، لیکن ایک ہاتھ سے کلام اللہ اور تفسیر کی کتابت کرکے روزی پیدا کرلیا کرتے تھے، کوئی نذر نیاز پیش کرتا تو قبول نہ کرتے، دولت مندوں اور شاہی عہدیداروں سے ملنا پسند نہ کرتے، برابر تلاوت کلام پاک میں لگے رہتے، تلاوت کرتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتا، عالمگیر کو ان کے توکل، استغنا، صلاح، تقوٰی اور فضیلت کی خبر ملی، تو برہان پور کے صدر کے ذریعے کوئی جاگیر دے کر ان کی مدد کرنی چاہی، لیکن انھوں نے جاگیر لینے سے یہ کہکر انکار کیا کہ میری طرح لاکھوں اور کروروں محتاجوں کو جو رزق دیتا ہے وہی مجھکو بھی

رزق دے گا"۔ (منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۸)

سورت کے ایک بزرگ سید سعد اللہ تھے، جو شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے عقلی و نقلی علوم اور سلوک کی تعلیم پاکر مکہ معظمہ چلے گئے، جہاں شریف مکہ نے ان کو بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا، وہ شریف مکہ سے لوگوں کی سفارش برابر کرتے رہتے، شریف مکہ نے ان کی ایک دو سفارش کو نظرانداز کردیا، تو وہاں سے بددل ہوکر سورت چلے آئے، عالمگیر کو ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو اس نے ان کی خانقاہ کے لیے ایک مکان اور ان کے اخراجات کے لیے دو گاؤں وقف کردیے، ہندو مسلمان دونوں ان کے یہاں آتے اور مستفیض ہوکر جاتے، اور دونوں ان کو اپنا پیشوا سمجھتے، وہ خلق اللہ کی نفع رسانی کی خاطر ہر خاص و عام کی سفارش عالمگیر سے کیا کرتے تھے، عالمگیر بھی ان کو دست خاص سے خط لکھا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کو لکھا کہ وہ صرف درویشوں، عالموں اور دینداروں کے لیے سفارش کیا کریں مگر انھوں نے بادشاہ کی بات نہ مانی، دوبارہ انھوں نے عالمگیر کو لکھ بھیجا کہ وہ ائمۂ اثنا عشری سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھے، عالمگیر نے بعض فضلا سے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، صحیح ہے، ایک بار سید سعد اللہ نے ایک ہندو کو خط لکھا تو القاب کے بجائے یہ شعر تحریر کیا:

بنام آنکہ او نامے ندارد بہر نامش کہ خوانی سر بر آرد

اس پر بعض علما نے اعتراض کیا، لیکن سید سعد اللہ نے یہ جواب دے کر ان کو خاموش کیا کہ ہم ذات پاک واجب الوجود کے بغیر تمام ممکن الوجود کو معدوم الوجود جانتے ہیں،

تا بدوں ذات پاک واجب الوجود ہمہ ممکن الوجود را معدوم الوجود میدانیم" (منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۶۱)

ایک دوسرے بزرگ میر مرتضیٰ واعظ ملتانی بھی تھے، شریعت کی پابندی کا بہت لحاظ رکھتے،

جہاں مجلس سماع ہوتی وہاں نہ جاتے، اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کرتے، جس محلہ میں رہتے، وہاں سرود و نغمہ کی آواز بلند کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی، شاہی حاکموں کے یہاں کھانا نہ کھاتے، اگر کوئی ان کے پاس آتا اور کہتا کہ مرید ہونے آیا ہوں تو وہ فرماتے یہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ توبہ و استغفار کرنے آیا ہوں، اور آئندہ کوئی بات یا کام شرع کے خلاف نہ کرونگا، پھر طرح طرح کے سوال کرتے، اور وہ جواب دیتا کہ ہر حال میں خدا کا حکم بجالاؤں گا، تو پھر اپنے حلقۂ ارادت میں لیتے، اس طرح ملتان اور لاہور سے دکن تک ہزاروں مریدان کے گرد جمع ہوگئے تھے، کسی سے نذرانہ نہ لیتے جب تک کہ ان کو یقین نہ ہوجاتا کہ نذرانہ دینے والے کی کمائی حرام کی نہیں ہے، اور وہ اپنی بیوی کا نفقہ اور فرزندوں کے حقوق کو ادا کرتا ہے، نذرانہ لیکر اس کے ایک خمس سے تجارت کرتے، روزے برابر رکھتے، شب بیداری کرتے تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے، اور جب وعظ کہتے تو ظالم حکام، ریاکار علما، اور حکام کے مصاحب فقرا کی بڑی مذمت کرتے، اور ایسے حکام کو برا کہتے جو خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرتے، سرود و نغمہ سنتے، اور بزرگوں کے مزار پر رقص و سماع کی محفل کراتے۔

ایسے بدعتی عوام کے خلاف بھی وعظ کہتے جو شب برات، عاشورہ اور عیدین میں خلاف شرع باتیں کرتے رہتے، میت کے نام پر کھانے پکوا کر تقسیم کرتے، اور ان کے نام سے فاتحہ دیتے، تمباکو کو حرام بتاکر اس کے پینے کی سخت مخالفت کرتے، ان کی اس شدت پسندی سے حکام، علما، اور مشائخ کو بھی ان سے عداوت ہوگئی تھی، اورنگ آباد کے قاضی القضاۃ قاضی اکرم ان کے بڑے مخالف ہوگئے تھے، اور ایک بار انھوں نے ان سے مناظرہ کیا تو بڑی نازک صورت حال پیدا ہوگئی تھی، عالمگیر پونا کے قلعہ کی تسخیر کے لیے وہاں پہنچا، تو میر مرتضیٰ اس سے ملنے گئے، اور اپنی ایک کتاب اس کو دی، جس کا نام حق گو تھا، عالمگیر نے اس کے دو تین ورق پڑھ کر کتاب کو

زانو پر رکھ دیا، اور دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر کہا الحمد للہ ثم الحمد للہ ہمارے زمانہ میں ایسے حق گو بھی ہیں، اور پھر شہزادہ کام بخش کو کہا کہ میر صاحب کو اپنے گھر میں ٹھہراؤ، اور وہ جو کچھ فرمائیں انکو سنکر ان کو عمل میں لاؤ، عالمگیر نے ان کے لیے کچھ ذریعۂ معاش بھی مقرر کرنا چاہا، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، کچھ دنوں کے بعد عالمگیر نے ان سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک ایسا شہر دیدوں جو آپ کے احتساب کے مطابق ہوجائے، انھوں نے جواب دیا کہ اگر خواص کے احتساب کے لیے مجھکو مقرر کریں تو میں راضی ہوں، عوام تو میرے گرویدہ پہلے ہی سے ہیں، عالمگیر نے کہا کہ خواص و عوام کے معنی نہ سمجھ سکا، اس وقت قاضی اکرم بھی موجود تھے، وہ بول اٹھے کہ سید صاحب کا مطلب بزرگوں کے مقبروں سے ہے، وہ اپنے مواعظ میں کہتے ہیں کہ جن بزرگوں کی قبروں پر طنبور، دہل اور دوسرے ساز بجائے جاتے ہیں، ان کی ہڈیوں کو اکھاڑ کر جلا دینا چاہیے، عالمگیر نے یہ سنکر کہا کہ میں اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں ہوں، میر مرتضیٰ نے انکار کیا کہ وہ ایسا نہیں کہتے، لیکن ان کی بات اس وقت نہ بنی، اور گو عالمگیر ان کی عزت کرتا رہا، لیکن انھوں نے بادشاہ کے یہاں آنا جانا کم کردیا، اور جب عالمگیر ان کو بلاتا تو وہ جاتے، پھر وہ علما اور مشائخ کی مخالفت کے خیال سے برہانپور منتقل ہوگئے، (منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۶۵-۵۶۱)

دہلی کے ایک بزرگ شیخ بایزید تھے، جن کے ہندو مسلمان دونوں معتقد تھے، وہ محتاجوں کی خبرگیری کرتے، اور حکام سے ان کی سفارش کرنے میں مطلق دریغ نہ کرتے، ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں وعظ میں کہنا شروع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لڑکیوں کی شادی ضرور کی، پھر عالمگیر کو مخاطب کرکے کہا کہ اس کی لڑکیوں میں بعض ناکتخدا کیوں ہیں، عالمگیر نے ان کے وعظ کو بہت خاموشی سے سنا۔ (منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۵۰)

عالمگیری عہد میں ملا قطب الدین شہید سہالوی بھی بڑے برگزیدہ بزرگ تھے، عالمگیر نے ان سے

کئی بار ملنے کی خواہش ظاہر کی، مگر ہر بار ملا صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کیا، ان کی اس بے رخی سے وہ کبھی دل گیر نہ ہوا۔ (فرحۃ الناظرین ص ۸۰)

شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اپنے علم فضل، عبادت، ریاضت، زہد و تقویٰ و تورع کے لحاظ سے مایۂ ناز علما میں سے گذرے ہیں، ان ہی کے خاندان سے علمی و روحانی فیوض و برکات کا وہ سرچشمہ پھوٹا ہے جس سے آج تک ہند و پاک کے ارباب علم اور اصحاب دل سیراب ہوئے ہیں، عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین شروع کرائی تو ان سے بھی معاونت چاہی، وہ شاہی دربار سے کسی قسم کی وابستگی پسند نہیں کرتے تھے، مگر اپنی والدہ کے اصرار پر فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب میں شریک ہوگئے، لیکن شاہ صاحب کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم نے دربار سے یہ تعلق پسند نہ کیا، اس لیے وہ جلد ہی اس کام سے علیحدہ ہوگئے، عالمگیر نے کچھ جاگیر دینی چاہی لیکن اسکو قبول کرنے سے انکار کیا، عالمگیر ان سے ملنے کا بڑا مشتاق رہتا، مگر وہ بادشاہوں اور امیروں کے گھر جانا اپنے روحانی بزرگوں کے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، ایک بار عالمگیر نے شاہ صاحب کے مخلص کے ذریعہ شوق ملاقات کا پیام بھیجا، مگر وہ دربار میں جانے پر مطلق راضی نہ ہوئے، بلکہ ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کے جوتے لپٹے رکھے ہوئے تھے، یہ عبارت لکھکر اسوقت کی دنیا کی سب سے بڑی حکومت کے شہنشاہ کے پاس بھیجدی۔

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیروں کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اِلَّا قَلِیْلٌ یعنی دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے، تم کو قلیل ترین جزء ملا ہے، اگر بالفرض مجھ دوگے تو وہ جزء لایتجزیٰ ہوگا، اس ٹکڑے کے لیے جو بھر ٹکڑا نہ ہو سکے گا، میں اپنے نام کو خدا تعالیٰ کے دفتر سے کیوں نکلواؤں، چشت کے بعض ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے، حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے۔"
(انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ ص ۶۹)

شاہ ولی اللہ اس خط کو نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو اپنی جیب میں رکھ لیتا، فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا۔

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ عالمگیر ایک راسخ العقیدہ مسلمان بننے کی کوشش کرتا رہا، اور راہ طریقت پر چلنے کے باوجود وہ شریعت کا بڑا پابند تھا، آج کل کے غیر مسلم مورخین اس کا ایک حکمران کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، تو اس کی شریعت نوازی پر تنقید و تنقیص دونوں کرتے ہیں، کیوں؟ اس کا جواب اس مقالہ کے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے، لیکن کوئی مسلمان اس کے خلاف برے الفاظ سننا پسند نہیں کرتا محض اس لیے کہ اس نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں میں مذہب کی ایک نئی روح پیدا کرنی چاہی، لیکن کیا یہ مستقل طور پر بیدار ہو سکی؟ اگر نہ ہو سکی تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سلاطین یا علماء، یا مشائخ؟ جس طرح عالمگیر کے جانشینوں پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر کی اُس سلطنت کو سنبھال نہ سکے جس کو اس نے غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک پھیلا دیا تھا، اسی طرح علماء اور مشائخ پر بھی یہ الزام آتا ہے کہ عالمگیری عہد میں مسلمانوں میں جو نئی مذہبی روح بیدار کی گئی تھی، اس سے وہ نبی کے وارث بن کر پوری بیدار مغزی سے فائدہ اٹھاتے، اور مسلمانوں کی مذہبی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو ہر طرح سنوارتے رہتے تو اس وقت مسلمانوں کی سیاسی زندگی بھی کچھ اور ہوتی، انھوں نے درس و تدریس کی مسند اور محراب و منبر اور خانقاہ کی زینت ہی بننے پر اکتفا کیا، اور اپنے فرائض کی ادائگی میں وہ کام انجام نہ دے سکے جن کی ان سے توقع تھی، یا جو بگڑی ہوئی معاشرت اور سیاست یا بدلتی ہوئی صورت حال میں ان کو اپنے مذہبی فکر و عمل، ایمانی جوش و طاقت اور روحانی بصیرت و تدبر سے کرنا چاہیے تھا،

فیضی اور اسکی تفسیر سواطع الالہام

از جناب محمد سالم صاحب. قدوائی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان میں تفسیر پر خاصا متنوع کام ہوا ہے، کچھ علماء نے علمی و فنی تفسیریں لکھیں، کچھ نے قرآن مجید سے احکام شرعیہ کا استخراج کیا، کچھ نے شرحیں اور حواشی لکھے، اسکے ساتھ بعض لوگوں نے اپنی ادبی مہارت اور زبان پر عبور کا بھی ثبوت پیش کیا۔ اسی قسم کے لوگوں میں عہد اکبری کی مشہور و معروف شخصیت شیخ ابو الفیض فیضی بن شیخ مبارک کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے، یوں تو فیضی کی شہرت اور اہمیت اس کی فارسی شاعری کی وجہ سے بہت ہے، لیکن اس کی عربی زبان کی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ اس کا بین ثبوت اس کی تفسیر سواطع الالہام ہے۔ فیضی نے یہ تفسیر غیر منقوط الفاظ میں لکھی ہے، جسے ادب کی اصطلاح میں "صنعت مہملہ" کہتے ہیں، عربی زبان میں اس قسم کی تصنیف کرنا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے، اور پھر پورے قرآن کریم کی تفسیر وہ بھی مختصر نہیں بلکہ تقریباً سات سو صفحات میں؛ فیضی نے اس اہم کام کو بہت تھوڑی مدت میں مکمل کر لیا۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

"سواطع الالہام یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی، کل مدت تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں اکثر فخر سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔"[۱]

۱؎ شعر العجم جلد ۳ ص ۵۰

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اس تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"برہان فضیلت شیخ فیضی سواطع الالہام تفسیر بے نقط است کہ ہزار سال پیشتر ہیچ مستعدی را میسر نہ شد، طرفہ این کہ این چنین کار دشوار، در عرض دو سال از مبدا بہ منتہی رسانید۔"[۱]

فیضی کو دربار اکبری میں بڑی حیثیت حاصل تھی، شروع میں تو درباری چشمک کی وجہ سے اسے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی، ان کے باپ شیخ مبارک اور بھائی ابو الفضل تینوں ٹھوکریں کھاتے پھرے لیکن پھر بعد میں بڑی جد و جہد اور مختلف وسیلوں سے دربار اکبری میں پناہ ملی، اکبر ان لوگوں کی بہت عزت کرتا تھا، دربار میں ان کا خاص مرتبہ تھا، دونوں بھائی انتہائی ذہین تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کو اکبر کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا، اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کٹر مذہبی طبقہ اکبر کے خلاف تھا اور اس کو مختلف فتوؤں میں الجھائے رکھتا تھا، اس دور کی اس کشمکش کو ختم کرنے میں ان دونوں بھائیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے، علامہ شبلی نے لکھا ہے:

"اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آ چکا تھا اور ان لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا لیکن خود جاہل تھا، اس لیے مذہبی فتوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، فیضی اور ابو الفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا اوزار ہاتھ آ گئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان متعصبوں کو شکستیں دیں اور ان کا سارا بھرم کھل گیا۔"[۲]

اکبر تو فیضی اور ابو الفضل سے خوش تھا، لیکن دربار کے دوسرے مذہبی لوگ جو خود اکبر کی

۱؎ مآثر الکرام ص ۱۹۹ ۲؎ شعر العجم ج ۳ ص ۳۸

بے اعتدالیوں سے پریشان تھے، ان دونوں بھائیوں سے بھی برگشتہ ہوگئے، اور ان کے ہر کام کو عیب کی نظر سے دیکھنے لگے فیضی شروع میں مذہبی امور میں بہت آزاد خیال تھا، اس لیے کٹر مذہبی طبقہ میں بے دین سمجھا جاتا تھا جس کا اظہار بھی اس دور کے مذہبی لوگوں نے جابجا کیا ہے، خاص طور سے ملا عبد القادر بدایونی اس میں پیش پیش ہیں، اس لیے جب فیضی نے اپنی تفسیر مکمل کی تو لوگوں نے اس کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلائیں، ملا صاحب لکھتے ہیں:

"تفسیر بے نقطہ برائے شستن بدنامی کہ تا روز جزا العبد آب شستہ نگردد در عین حالت مستی وجنابت می نوشت وسگاں آں را از ہر طرف پائمال ساختند۔"[۱]

اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے الزامات لگائے گئے، لیکن تفسیر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں بے بنیاد اور محض دربار دشمنی پر مبنی ہیں، فیضی اگر چاہتا تو تفسیر میں اپنی آزاد خیالی کو قائم رکھتا اور کلام اللہ کے معانی و مفہوم میں تحریف سے کام لیتا، لیکن اس نے ایک جگہ بھی ایسا نہیں کیا ہے، محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

"زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں کہیں مگر نفس مطالب میں جب نواب کوئی دم نہیں ہلکتا، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بے دینی اور بدنفسی پر آجاتے تو جو چاہتے لکھ جاتے انھیں ڈر کس کا تھا۔"[۲]

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"فیضی نے تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے، لیکن ایک ذرہ مسلمات عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا، ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا، لیکن وہ ان تمام عقائد کا معترف

۱؎ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۹۹ ۲؎ دربار اکبری ص ۴۳۰

نظر آتا ہے جن کو معتقدات عوام کہتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو سنتے ہیں زبانی سنتے ہیں، تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجدی نظر آتا ہے۔"

ملا بدایونی کا بھی عجیب معاملہ ہے، کہاں تو فیضی اور اس کی تفسیر کی اتنی مخالفت اور مذمت اور دوسری طرف خود اس کی تاریخیں کہیں اور تقریظیں بھی لکھیں۔ لکھتے ہیں:

"و فقیر من "احسن التفاسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم علم القرآن" تاریخ یافت و توقیعی نوشت انشاء اللہ تبقریبی در محل خود مذکور گردد۔"[۲]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے خلاف ملا صاحب کے جذبات و خیالات کی بنیاد حسد پر قائم تھی، فیضی نہایت ذہین و دانشمند تھا، اور ملا صاحب پر بازی لے گیا تھا، اکبر پر بھی اس کا بہت اثر تھا، اس لیے ملا صاحب شاید اس کو برداشت نہ کر سکے۔ علامہ شبلی ابو الفضل کے بارہ میں ملا صاحب کے خیالات کو بے بنیاد ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملا صاحب اور ان کے تمام پیرووں نے متفقاً فیضی کو ملحد، بے دین، زندیق اور کافر لکھا ہے، ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فیضی مرنے کے وقت کتوں کی طرح بھونکتا تھا، اور اس کے ہونٹ سیاہ ہوگئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فیضی کے رتبہ کو سمجھ نہیں سکتے تھے، وہ جو حکیمانہ خیالات ظاہر کرتا تھا، ان لوگوں کو الحاد اور زندقہ نظر آتا تھا۔"[۳]

ابتدا میں فیضی کے تعلقات شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے بہت خوشگوار تھے، دونوں آپس میں بے تکلف تھے، اور ایک دوسرے کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، لیکن مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد شیخ کے مزاج میں بڑی تبدیلی ہوگئی تھی، ان کی روحانیت بہت بڑھ گئی تھی، انھوں نے فیضی کو اس وقت

۱؎ شعر العجم ج ۳ ص ۲ ۵ ۲؎ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۹۳ ۳؎ شعر العجم ج ۳ ص ۴۸

دیکھا تھا جب وہ متعصب علما کا زور گھٹانے میں مصروف تھا، اور عام لوگوں کی نظر میں لامذہب بے دین سمجھا جاتا تھا، شیخ کے ذہن میں اب بھی فیضی کی وہی تصویر تھی، اس لیے وہ اب سواطع الالہام، موارد الکلم اور نل دمن والے فیضی سے بھی نہ ملنا چاہتے تھے، انھوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا[1]، شروع میں فیضی کو اس کا اندازہ نہ ہو سکا، چنانچہ شیخ کی واپسی کے بعد فیضی نے ان کو خط لکھا اور شوق ملاقات کا اظہار کیا:

"اگر بال و پرے می داشتم ہر روز بر بام آں حجرہ می نشستم و دانہ چیں نکات محبت می شدم"۔

اسی طرح سے جب فیضی تفسیر لکھ رہا تھا، تو اس نے کئی بار اس کی کوشش کی کہ شیخ کو دکھائے اور ان سے مشورہ لے، مگر شیخ غالباً فیضی سے بہت زیادہ خفا تھے، اس کا موقع نہیں دیا، صاحب نزہتہ الخواطر نے شیخ عبدالحق کی رائے اس طرح سے پیش کی ہے:

قال الشیخ عبد الحق ابن سیف الدین الدهلوی فی کتابه فی اخبار الشعراء انه کان ممن تفرد فی عصره بالفصاحة والبلاغة والمتانة والرصانة ولکنه لوقوعه وهبوطه فی هادیة الکفر والضلالة اثبت علی جبینه نقوش الرد والانکار والادبار، ولذلک یتنکف

شیخ عبدالحق ابن سیف الدین اپنی کتاب اخبار الشعرا میں لکھتے ہیں کہ فیضی اپنے زمانہ میں فصاحت و بلاغت اور تحریر کی متانت و استواری میں منفرد تھا، لیکن کفر و ضلالت کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے اسکی پیشانی رد و انکار و ادبار سے داغدار ہو گئی تھی، اس لیے دیندار طبقہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احبا، اور جو لوگ آپ سے نسبت رکھتے ہیں، فیضی اور اس کے ہم مشربوں

[1] حیات عبدالحق ص ۲۴۲

اهل الدین والملة واحباء النبی صلی اللہ علیه وسلم ومن ینتسب الیه من ان یذکروا اسمه واسماء رهطه تاب اللہ علیهم ان کانوا مومنین[1]

کا نام لینا پسند نہیں کرتے۔

لیکن ان باتوں کا اثر اس کی تفسیر میں کہیں نظر نہیں آتا، فیضی عقائد اسلام پر پورا ایمان رکھتا تھا، اپنی تفسیر اور دوسری تصانیف میں ملائے مسجدی نظر آتا ہے اور کہیں بھی آزاد خیالی کا اظہار نہیں کرتا، تفسیر کی ابتدا یوں کرتا ہے:

"اللہ لا الہ الا ھو لا اعلمه ماهو وما ادرکه کما ھو، احامد الحامد ومحامد الاحامد لله مصعد لوامع العلم وملهم سواطع الالہام"۔

تفسیر کے شروع میں مقدمہ ہی سے اس کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ فیضی کے خیالات میں بے راہ روی اور مذہب سے بیگانگی نہیں ہے، بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے کہ اس کے کام کو آسان اور جلد مکمل کرا دے، قرآن مجید کی عظمت و اہمیت کا ذکر کرتا ہے، اور اسے تمام علوم اور حکمتوں کا منبع قرار دیتا ہے،

اس کے بعد اپنے مولد آگرہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے، یہاں کے علما، کی مجلسوں، مدرسوں، مسجدوں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، علوم قرآنی کی تفصیل بیان کی ہے، اس کے بعد بادشاہ کی تعریف کی ہے، اور اس کا نام معمہ میں اس طرح لکھا ہے:

"وھو وسط الدلماء (دلماء کا مترادف ہے لجی جس کے معنی گہرا سمندر، اسکا وسط یعنی ج)، املاء الساحل (ساحل کا آخری حصہ یعنی ل) نجواء السماء،

[1] نزہتہ ج ۵ ص ۲۷

(سماء کا جھنڈا یعنی ا) سر العلوم (یعنی علوم کا راز ل) علم الاکمال (اکمال
کا علم یعنی ا) اُسّ العدل (عدل کی بنیاد یعنی ل) اساس الاسداد (سداد کی
اساس یعنی د) محصول الود (ود کا محصول د) حاصل الکل (کل کا مترادف
اجمعین ہے اس طرح سے "ین" اس کا حاصل ہوا) اصعد الملوک (ملوک کا بلند حصہ
یعنی م) اصل الصوالح (صوالح کی اصل ح) مطلع المکارم (مکارم کا مطلع یعنی م)
امام الدول (دول کے سامنے کا حصہ د) عماد العالم (عالم کا ستون یعنی ا)
معاد المعارک (معارک کا معاد ک) حد الاحلام (احلام جس کا مترادف
الباب ہے، کا آخری حصہ ب) مآل الادوار (ادوار کا انجام یعنی ر)
ان تمام حروف کو یکجا اور مرتب کرنے سے بادشاہ کا پورا نام یعنی جلال الدین محمد اکبر
بنجاتا ہے، اسی طرح سے اپنا، اپنے والد اور اپنے بھائیوں کا تعارف کرایا ہے، چونکہ ہر نام
میں نقطے آتے ہیں، اس لیے فیضی نے معمہ والی ترکیب استعمال کی ہے، اور اشاروں کنایوں
میں تمام لوگوں کے نام لکھے ہیں، اپنے والد شیخ مبارک کا نام اس طرح لکھا ہے:-

"اساس العالم (علم کی بنیاد یعنی آخری حصہ م) اصل الروع (روع کا مترادف
قلب ہے، اس کی جڑ یعنی ب) مطلع الالہام (الہام کا پہلا حصہ ا) راس
الرؤس (رؤس کا سر یعنی پہلا حصہ ر) امام الکرام (کرام کا سامنے کا حصہ ک)

اس طرح سے مبارک کے پانچ حروف یعنی م + ب + ا + ر + ک نکلتے ہیں۔ اس
انداز کو اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی تعقید پیدا ہو گئی ہے، اور جب تک پہلے سے ناموں کا
صحیح علم نہ ہو سمجھ میں نہیں آسکتے لیکن اس سے فیضی کی عربی زبان پر قدرت کا اندازہ ضرور
ہوتا ہے۔

فیضی نے تفسیر لکھنے سے پہلے مشق کے طور پر "موارد الکلم" بھی بے نقط لکھی تھی، اس کی
نقلیں مختلف ملکوں میں بھیجیں جس کو لوگوں نے پسند کیا۔

جب فیضی نے اس تفسیر کو لکھنے کا ارادہ کیا اور اپنے والد سے اس کا ذکر کیا تو وہ
بہت خوش ہوئے، اور جب اس کے اجزاء مختلف اوقات میں لکھ کر ان کو دکھائے تو انکی
مسرت وشادمانی بہت بڑھ گئی، انھوں نے بہت سراہا، اور بڑی ہمت افزائی کی جس کا
ذکر فیضی نے تفصیل سے کیا ہے[1]، اس کے بعد اسی مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر لکھی جا رہی تھی کہ
بادشاہ نے اپنے پاس بلا لیا، اس لیے یہ کام رک گیا، لیکن پھر تھوڑے عرصے کے بعد فیضی کو اسے
مکمل کرنے کا خیال آیا، یہاں فیضی اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے اس کام
کو کرنے کا موقع دیا، تھوڑے عرصہ بعد تفسیر لاہور میں مکمل ہو گئی[2]۔ اس تفسیر میں فیضی نے جو انداز
اختیار کیا ہے، اس کے متعلق خود لکھا ہے:

"کل کلام ادرد المحرر لصدع کلام اللہ واعلاء مدلولہ ہو الملع
مما اولہ ومدلولہ اصح والکلام العسر مدلولہا وادرادہا المحرر
واسطہ الکلام لعمرک ماہو مدلول اصل کلام اللہ وما حررہا
الا لاعلاء احوال الرسل والامم واعلاء دواعی ارسال السور
والکلام والکلم وما ہو اصل المراد"[3]

خدا معلوم لوگوں نے فیضی کو ملحد و بیدین کیسے کہہ دیا، اس کی تصانیف میں کہیں بھی اس کا
ثبوت نہیں ملتا، اگر وہ ملحد اور بے دین ہوتا تو قرآن کریم کی تفسیر کیوں لکھتا؟ اور اگر لکھا تھا تو
اس کے معنی و مفہوم کو مسخ کرنے کی کوشش کرتا، تفسیر میں تو اس کے بہت سے مواقع تھے، تفسیر کے

[1] ص ۸ [2] ص ۹ [3] ایضاً

مقدمہ میں بھی بہت کچھ لکھ سکتا تھا، لیکن اس نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ لکھتا ہے:

اصل المراد واس المرام هو الله	اصل مقصد و مراد معرفت الٰہی ہے، اس کے
وحده وله رسل ارسلهم لاصلاح	رسول ہیں جن کو اس نے عالم کی اصلاح
العالم وهم موصل المراد لاحصر	کے لیے بھیجا ہے، وہ مراد تک پہنچانے والے
لا عدد لعددهم اولهم ادم واحدهم	ہیں، ان کی تعداد کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا،
وحامدهم محمد صلعم، اکمل الرسل	ان میں سب سے پہلے آدم اور آخری محمد صلعم ہیں،
امرا واعلمهم سرا واحمدهم	جو رسولوں میں سب سے کامل، اسرار کے سب سے
حالا واسماهم کمالا واکرمهم	زیادہ جاننے والے، احوال میں سب سے
والهم واعلاهم لواء محمد رسول الله	زیادہ قابل تعریف، کمالات میں سب سے بلند
صلعم له لواء الحمد ومأواه	والا، سب سے اکرم، سب سے اونچے پرچم والے
المحمود لواء لاهل الولاء	محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ ہی کیلیے
ودعاءه موسوم الواح السماء له	حمد کا لوا ہے، اور آپ کا مقام محمود ہے،

(حاشیہ: ان کا لوا، اور ان [illegible] ہے)

کلام پاک کی وسعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

علم کلام الله دا ماء لا ساحل له	کلام اللہ کا علم ایک بے پایاں سمندر ہے جس کا کوئی
وطود لا مسلک له وکل واحد	ساحل نہیں، ایسا بلند ٹیلہ ہے جس کا کوئی راستہ نہیں
اراد وصوله ورام سلوک درکه	پاسکتا، جو شخص بھی وہاں تک پہنچنا چاہے اور اس کے
وما ادرک حده. علم الله	پانے کا طریقہ معلوم کرنا چاہے تو اس کی حد کو نہیں پاسکتا۔
احاط الکل وهو الملک العلام	اللہ تعالیٰ کا علم سب کچھ احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ ملک العلام
ما له علومکم واعمالکم واحوالکم	اور تمھارے سارے علوم اور اعمال اور تمھارے

۱؎ ص ۱۰

وما لکم وعلوم الکل لوامع علمه	حال اور مآل کو جانتا ہے اور تمام علوم اس کے
ومعلومهم سواطع معلومه	علم کی ایک کرن اور ان کے معلوم اس کے
(ص۱۰)	معلوم کا ادنیٰ پرتو ہیں۔

آگے چل کر مختصراً نزول قرآن کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح نازل ہوتی تھی اور آپ کی اس وقت کیا کیفیت ہوتی تھی، اس کے بعد جمع و ترتیب قرآن کے متعلق لکھا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ کلام مجید میں کل کتنی سورتیں ہیں، ہر سورہ میں کتنی آیات ہیں، قرآن مجید کے بہت سے نام ہیں، ان میں سے جو بے نقط ہیں مثلاً صراط، کلام، امام وغیرہ، اور قرآن مجید کے حفاظ اور اس کے ابتدائی مفسرین حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، حروف کے صحیح تلفظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمام حروف کو ادا کرنے کا ایک خاص انداز ہے، اس سلسلہ میں بہت سے الفاظ کی تشریح کی ہے مثلاً اللھم، لعل، ام، کاد، لما، لولا وغیرہ۔ اسی طرح سے محکم اور غیر محکم آیات و الفاظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، محکم وہ ہیں جن کا سمجھنا آسان ہے، اور غیر محکم وہ ہیں جن کا علم سوا اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں، جیسے علم معاد، سورتوں کے ابتدائی الفاظ مثلاً الٓمٓ، الٓرٰ، طٰسٓمٓ وغیرہ۔ اس کے بعد تفسیر سے متعلق بعض بھی بعض ضروری باتیں بیان کی ہیں، مقدمہ کے آخر میں دوبارہ بارگاہ خداوندی میں عاجزی و انکساری سے دعا مانگی ہے۔

اللھم اسئلک صوالح الاعمال ومصالح الآمال مادام مرالدهور وکر الاحوال والماهول اصلاح الکلام وهو اصلح اوامر الکرام واسلم مراسم الاسلام وما اصدر ماهو المعهود والمراد مهر دا مورد الما لول کلام الله وماول کلمه وحاصل اسراره وهو الملهم بالسداد والممد للمداد" (ص۱۲)

مقدمہ خاصا بسیط ہے جس میں مذکورۂ بالا باتیں تفصیل سے بیان کی ہیں، مقدمہ کے دو حصے ہیں، پہلے میں اپنا اور اپنے اعزا کا حال لکھا ہے، دوسرے میں علوم قرآنی کا مفصل تذکرہ ہے۔ ان دو حصوں کو بھی الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اور ہر باب کا نام ساطعہ رکھا ہے، بعض ساطع بہت مختصر صرف سطر ڈیڑھ سطر کے ہیں، اور بعض خاصے طویل تیس تیس سطروں تک کے ہیں، مقدمہ کے خاتمہ پر ایک نظم بھی لکھی ہے، اس میں بھی صنعت مہملہ کا التزام رکھا ہے۔

اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تفسیر شروع کی ہے تفسیر سے پہلے اس کی اہمیت و عظمت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

وھو اول السور وصدر کلام اللہ مطلع صراح العلم والکلام مصدر مصادر الاوامر والاحکام سلّم مصاعد الحکم والاسرار مدار مصالح الاعمال والاسماء در دور سلسال الارواح والصدور ساحل داماء الھم والسرور سماء عوالم اللمع والحلک" (ص ۲)

اسی جگہ پر سورۂ الحمد کے جو دوسرے نام ہیں ان کا تذکرہ بھی کر دیا ہے، اور وجہ تسمیہ لکھی ہے:۔

"ولھا اسماء احصاھا العلماء، احدھا الدعا لما ھو مدعو اھل اللہ وھم دعوہ لحصول المرام، والاساس لما ھو اس الکلام واصلہ والام لما ھو حامل لمدلول الکل والحمد لما ھو اول کلمھا کما حکم لاسماء السور کلھا۔"

"ایاک نعبد" کی تفسیر میں لکھا ہے۔

طوعا لاکرھا کما ھو مامورک ومرادک وھو حصر لکمال الطوع

والھلوع۔" (ص ۲۲)

تفسیر میں سورتوں کی شان نزول بھی بیان کی ہے، اور پورے واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کر دیا ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی خاص قابل ذکر بات ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی کر دیتے ہیں، مکی و مدنی کی بھی تصریح کر دی ہے، مکی سورتوں کا ذکر "مورد ھا مصر رسول اللہ صلعم" اور مدنی سورہ کا "مورد ھا ام الرحم" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔

سورۃ النجم کے متعلق لکھتے ہیں:

"مورد ھا ام الرحم ومحصول اصول مدلولھا العھد لسداد ما کلمہ الرسول وارسالہ مما اللہ وصدع صعودہ اسماء کلھا السمر المعھود وادکار کلام الاعداء الادم وسوء ما وھموا للاملاک ودماھم ومدح رھط طرحوا الاصار ولوم ماعدل وراء الاسلام وصدع اعطاء اعدال الاعمال معادا واعلاء صدوع الادلاء لوطود الاسر وطولہ والوماء لاحوال الامم الھلاک وھول اھل العالم عما احاط ورود السعواء وامرھم بطوع اللہ۔" (ص ۶۲۵)

سورۃ النصر کے متعلق لکھا ہے:

"مورد ھا مصر رسول اللہ صلعم ومحصول اصول مدلولھا اعلام اسعاد اللہ لرسولہ واکمال امدادہ لاھل الاسلام وسلوکھم مسالک الاسلام رھطا رھطا والامر لحمد اللہ ورسولہ ومحو الاصار والھود امل الامر" (ص ۷۲۴)

اسی طرح تمام سورتوں کے شروع میں مختصراً ان کا تعارف کرایا ہے، اور ان کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تفسیری نقطۂ نظر سے اس تفسیر کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ تعقید ہے جو صنعت مہملہ کے التزام کا نتیجہ ہے، اگرچہ فیضی نے بہت کوشش کی ہے کہ کوئی بات تشریح و توضیح سے رہنے نہ پائے، اس کے باوجود بعض عبارتیں بہت مشکل ہو گئی ہیں، عام طور سے لوگوں نے اس تفسیر کو ایک بے مقصد اور فضول کام کہکر اپنی جان بچالی ہے، لیکن اسکو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔

سورۂ آل عمران میں محکم و متشابہ آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ھو اللہ الذی انزل ارسل علیک محمد الکتب المعھود المعلوم اسماً ورسماً منہ السطور المعلوم المعھود آیت محکمت محکم کلھا واحکامھا مؤکدۃ لانّھا مصرح مدلولھا والمراد ما امرہ اللہ وسطر کل طرس ارسلہ او کلامھم ما حمل الا محملاً واحداً والحاد للمحکم ھنّ ام الکتب اصلہ ومردّ ما وراءھا واُخر ما عداھا متشبھت لا مسلک لادراک مرادھا ومدلولھا کمطالع السور وکلھا ما اوّل ما صرح اللہ مرامہ او ما لا امرہ اللہ وسط کل طرس او ما لہ محامل او المحدود۔"

پورے قرآن مجید کی تفسیر کا یہی انداز ہے، عبارتوں میں اختصار اور معانی و مفہوم کو سہل انداز پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن چونکہ تفسیر سے زیادہ صنعت گری پیش نظر ہے، اس لیے اسکو سمجھنا خاصا مشکل ہو گیا ہے، ملا بدایونی وغیرہ نے اس تفسیر کی مخالفت محض رشک و حسد کی بنا پر کی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر فیضی نے اس کو صنعت مہملہ میں نہ لکھا ہوتا تو اس کے خیالات زیادہ ہو

واضح ہوتے، اور لوگوں کو جو غیر منقوط عبارات کی بدعت نظر آتی ہے فیضی اس سے بچ جاتا، لیکن فیضی غالباً کلام اللہ کے اس معجزہ کو بھی دکھانا چاہتا تھا کہ اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے جا سکتے ہیں، حتی کہ اس کی تفسیر غیر منقوط الفاظ میں بھی لکھی جا سکتی ہے، اسکے علاوہ عربی زبان پر اپنی قدرت کا ثبوت دینا چاہتا تھا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب الفاظ کا سرمایہ محدود ہو تو تعقید کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تفسیر کا مفہوم ہی خبط ہو گیا ہے، ایسا نہیں ہے، جہاں سے اس کو پڑھا جائے مطلب سمجھ میں آجاتا ہے،

فیضی نے جب یہ تفسیر لکھی اس وقت کسی نے اس کی زبان یا مطالب پر اعتراض نہ کیا، بلکہ صرف غیر منقوط کی بدعت پر اعتراض تھا، اسی بنا پر اس کو بدعتی قرار دیا گیا۔

فیضی کی یہ تفسیر کم و بیش ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے، لیکن اس ضخیم کتاب میں کہیں بھی کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی، اکبری دور میں جبکہ دربار کا رنگ بالکل غیر مذہبی تھا، فیضی کا اس تفسیر کو لکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ محض اس کا مذہبی جذبہ تھا کہ اس نے اتنا بڑا کام کر ڈالا، اگر اس تفسیر سے اس کو کوئی دنیاوی فائدہ یا درباری رتبہ بڑھانا یا بادشاہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہوتا تو یقیناً اس نے اس میں دوسرے قسم کے خیالات ظاہر کیے ہوتے۔

اس تفسیر کی مذمت صرف ملائے بدایونی کے یہاں ملتی ہے، اور جن لوگوں نے اس کے بارہ میں لکھا ہے، انہی کے حوالہ سے لکھا ہے، فیضی نے تفسیر لکھنے کے بعد اس کے نسخے مختلف ملکوں میں بھیجے تھے، اور روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سب نے اس کو پسند کیا، کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا، اس زمانہ کے متعدد بڑے علماء نے تقریظیں لکھیں اور تاریخیں کہیں، جو اس تفسیر کے آخر میں درج ہیں، ان علماء میں محمد حسینی المشہور بالشامی، مولانا یعقوب صیرفی کشمیری، قاضی نور اللہ شوستری، امان اللہ ابن غازی سرہندی وغیرہ کے نام ہیں، طوالت کے خیال سے انکی رائیں تفسیر کے بارہ میں نقل

نہیں کیں۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے بھی اس تفسیر کی تیاری میں مدد کی تھی، اور اس کا ایک مشکل حصہ جو فیضی نہیں لکھ سکتا تھا، مجدد صاحب نے لکھکر دیا تھا،[۱] جو اس کا ثبوت ہے کہ حضرت مجدد صاحب کی نظر میں بھی فیضی کی یہ کوشش قابل اعتراض نہ تھی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب نظامِ تعلیم و تربیت میں بہت تفصیل سے فیضی اور اسکی تفسیر کے متعلق خیالات ظاہر کیے ہیں، یہاں ان کی رائے نقل کیجاتی ہے:

"میرا خیال ہو کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی، مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود ملانے یہ کمال کیا ہو کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہو، اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہو ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہو جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہو، گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہو تاہم وہ بہرحال ایک غیر معمولی ذہن و دماغ کا آدمی تھا، بیچ بیچ میں بعض نکتے... اس کے قلم سے بے ساختہ نکل گئے ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اچھی خاصی چیز ایسی جمع ہو سکتی ہے جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دیا جا سکتی ہے۔"[۲]

---

[۱] زبدۃ المقامات ص ۱۳۲

[۲] نظامِ تعلیم و تربیت (ج ۲) غالباً فیضی کی ہی تفسیر سے متاثر ہو کر ۱۲۲۴ھ میں شام کے ایک عالم سید محمود آفندی نے درر الاسرار کے نام سے ایک غیر منقوط تفسیر لکھی، جو شائع بھی ہو گئی ہے، فیضی کی اور ان کی تفسیر میں فرق اتنا ہے کہ فیضی ذرا تفصیلی انداز اختیار کرتے ہیں لیکن محمد آفندی اختصار۔ انشاء کا سرمایہ کم و بیش ایک ہی ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری غیر منقوط مکمل تفسیر کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس طرح سے فیضی اس میدان کا پہلا شہسوار ہے اور ہندوستان پہلا ملک ہے جہاں ایسی تفسیر لکھی گئی۔

فیضی کی تفسیر ہر اعتبار سے مکمل اور خاصی اہم ہے، اور اسے کسی بھی دوسری تفسیر کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے، تفسیری خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ ایک قابل قدر علمی و ادبی کارنامہ بھی ہے، فن تفسیر کے نقطۂ نظر سے اس میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آتی، البتہ کتاب کا مقدمہ خاصا مشکل ہے، خاص طور سے وہ عبارتیں جہاں وہ لوگوں کے نام اور اسی قسم کی دوسری باتیں بیان کرتا ہے، لیکن اصل تفسیر کا حصہ مشکل نہیں ہے، تھوڑی توجہ اور محنت سے مطالب سمجھ میں آجاتے ہیں،

اس تفسیر سے عربی زبان کی حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ثبوت ملتا ہے جس میں خدا کا آخری پیغام نازل ہوا، اور اس پر فیضی کی قدرت اور کمال انشاء کا بھی، ہندوستانی مفسرین کے کارناموں میں یہ کتاب ایک بڑا اہم کارنامہ ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاتی اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

ضخامت ۲۸۰ صفحے قیمت ۶ے

منیجر

مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاعِ مشرق سے

از جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ساتویں صدی ہجری کے شروع میں سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے دورِ سلطنت میں ترکستان کے شہر گردیز سے جو نواحِ بخارا میں ہے، دو بھائی دہلی آئے، ایک سید شمس الدین اور دوسرے سید شہاب الدین، کچھ دنوں کے بعد دونوں بھائیوں نے پھر رختِ سفر باندھا، سید شمس الدین نے دہلی کے قریب ہی علاقۂ میوات کو اپنی منزل قرار دیا، جہاں ان کی اولاد پھلی پھولی اور آباد ہوئی، اور سید شہاب الدین نے دہلی سے دور بہ سمت مشرق مانک پور میں اقامت اختیار کی، جہاں انکو اور ان کی نسل کو بڑا فروغ ہوا، امارت و مشیخت اور دین و دنیا کے امتزاج نے ان کے قدم چومے، شاہی منصب، جاگیرداری اور زمینداری نے ان کا استقبال کیا، آگے چل کر روحانیت و مشیخت نے بھی ان کو حسنِ قبول بخشا، امراء و سلاطین سے لیکر عوام تک ان کے قدردان بن گئے، راجہ کا خطاب ان کو پہلے ہی عوام سے مل چکا تھا، اب شیخ اور شاہ کا خطاب بھی مل گیا، ان ساداتِ گردیزیہ کو سرزمین مانک پور بہت راس آئی، ایک طرف انھوں نے سلاطین وقت سے بڑے بڑے عہدے، اور دوسری طرف مشائخِ زمانہ سے فیوض و برکات حاصل کیے، اور ظاہری معنوں میں بھی "آنان کہ در فقیری شہنشاہی کردہ اند" کے مصداق بن گئے۔

پھر ان کی یہ فقیری و شہنشاہی صرف حدودِ مانک پور تک نہیں رہی، بلکہ بعد میں اس خاندان کے اک گوہرِ شب چراغ راجہ سید حامد شاہ مانک پوری نے حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ

کی صحبت و خدمت میں رہ کر اور امارت و مشیخت کا دائرہ اور وسیع کر کے مشرق کی طرف ایک اور قدم بڑھایا، اور جونپور کو مرکز بنا کر بلادِ پورب کو اپنے زیرنگیں کیا، اور یہاں ساداتِ گردیزیہ کا وہ اثر و اقتدار ہوا کہ سلاطینِ شرقیہ، سلاطینِ لودی اور سلاطینِ تیموری کی حکومتوں میں انقلاب آتے رہے، مگر ان کا دربار برابر جما رہا، اور سلطنتوں کے انقلاب میں ان کے فیوض و برکات کا منارہ برابر روشنی پھیلاتا رہا،

آئندہ صفحات میں مانک پور کے ان ہی مشائخِ گردیزیہ اور بلادِ پورب میں ان کے دینی و روحانی کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سید شہاب الدین گردیزیؒ جیسا اوپر معلوم ہو چکا ہے، آپ اپنے بھائی سید شمس الدین کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے زمانہ میں گردیز سے دہلی تشریف لائے، آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: سید شہاب الدین بن زین الدین بن عیسیٰ باقر بن نظام الدین ابو العلی محمد بن ابو طالب حمزہ بن محمد ابن طاہر ابن امام جعفر زکی النفس[1]۔ سید شاہ ابو الحسن نے آئینۂ اودھ میں ابو طالب حمزہ بن سید جعفر ابن سید امام نقی لکھا ہے[2]، شاہ عبد الحق صاحب دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں راجہ سید حامد شاہ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"در زمان سلطان شمس الدین التمش دو برادر از ساداتِ گردیزیہ بدہلی قدم آوردہ بودند یکے سید شمس الدین در زمین میوات سکونت کرد، و بقیہ اولاد او در آنجا ماندہ اند، و دیگرے سید شہاب الدین کہ جد امجد اوست، بزرگان ایشان معزز و مکرم بودہ اند، و در زبان مردم آن دیار برایشان اسم راجی غالب آمدہ[3]"

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاولیاء میں لکھا ہے "و اسم راجی خطاب سید شہاب الدین کہ جد راجی حامد شاہ بودہ[4]"

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۰۰، [2] آئینۂ اودھ ص ۱۶، مطبع نظامی ۱۳۰۵ھ [3] اخبار الاخیار ص ۱۹۳ [4] خزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۰۹، طبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۳ء

آئینۂ اودھ میں ہے کہ آپ بحکم باطن ساکن مانک پور ہوئے بعض گردیزی راویوں کے بیان کے مطابق آپ کو حکومت سے منصب سلطانی اور مانک پور کی جاگیر ملی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی اولادیں دیں کہ ان سے کئی مواضعات آباد ہوگئے۔ اور سلاطین جونپور کے زمانہ میں بڑا اقتدار حاصل ہوا، ایسا اقتدار ظاہری و باطنی دوسرے سادات کو حاصل نہیں ہوا، آپ کا مزار پہلے مانک پور میں لب دریا تھا، بعد میں دریا برد ہونے کے خوف سے آپ کی اولاد نے آپ کی نعش کو آراضی شہاب الدین پور میں دفن کیا جہاں آپ کا روضہ ابتک موجود ہے۔[1]

سید شرف الدین اور سید عزالدین سید شہاب الدین کے یہ دونوں صاحبزادے ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع اور اپنے باپ کے صحیح جانشین تھے، ان کو حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسینی بخاری متوفی ۷۹۵ھ کی توجہ نے خصوصی فیض بخشا، سلطان الشرق خواجہ جہاں سرور متوفی ۸۰۲ھ کے دور حکومت میں آپ مانک پور تشریف لے گئے، جو جونپور سے اسّی میل دور ہے اور شرقی سلطنت میں شامل تھا، سید شرف الدین اور سید عزالدین (یا عزیزالدین) نے حضرت مخدوم جہانیاں کا ان کے شایان شان استقبال کیا، اور ان کو مہمان بناکر خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، مخدوم صاحب نے ان سے دریافت کیا، کیا بات ہے کہ آپ لوگوں میں بعض اسلحہ بند ہیں اور بعض خرقہ پوش؟ انھوں نے عرض کیا کہ سلاطین و حکام کی طوائف الملوکی کی وجہ سے غیر مسلم موقع پاکر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، اسی لیے ہم لوگ ہتھیار بند رہا کرتے ہیں، مخدوم صاحب نے سید عزالدین کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم راجہ ہو اور سید شرف الدین سے فرمایا کہ تمھارے لیے عہد قضا ہے، اب تم کو کوئی متمرد تکلیف نہ دے سکے گا، بشرطیکہ تم لوگ اپنے آبا و اجداد کے دین پر رہ کر کتاب و سنت کی اتباع کرو، اگر تم اس پر قائم رہے تو یہ دونوں باتیں تم سے ختم نہیں ہوں گی، جب مخدوم صاحب مانک پور سے واپس ہوئے

[1] آئینۂ اودھ ص ۱۶۸

تو یہ دونوں بھائی پرگنہ پرتاب گڈھ تک ہمراہ آئے۔[1] سید علی موسوی حیدرآبادی نے مشکوٰۃ النبوۃ میں لکھا ہے کہ

"سید عزالدین جد شریف سید حامد شاہ سجادہ نشین آبا، خود بودند"

پھر اوپر کے واقعہ کو اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے، اور اس میں صرف سید عزالدین کا نام لیا ہے،

"در زمانے کہ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری سیاحت دیار شرق نمود، با سید عزالدین کہ از مشاہیر مشائخ بود بملاقات نمودہ معائنہ فرمود کہ سید لباس مشائخانہ ندارد و سلاح می بندد، مخدوم پرسید کہ سبب سلاح بستن چیست، سید گفت دریں ملک راجہائے اہل فساد بر مسلماناں تاخت می کنند، مخدوم فرمود کہ از امروز ولایت بر شما باشد، الحال شما راجہ ایں ملک شدید، پس ازاں روز خطاب راجہ بر اولاد ایشان جاری شد۔"[2]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عزالدین اپنے والد شہاب الدین کے خلیفہ اور جانشین تھے، اور مخدوم جہانیاں نے ان کو ہی راجہ کا خطاب دیا تھا، جو بعد میں رواج پایا،

راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ آپ سید عزالدین (یا عزیزالدین) کے پوتے ہیں، حسینی اور رضوی کی نسبت سے مشہور ہیں، آپ نے مانک پور کے سادات گردیزیہ کی تاریخ میں ایک نیا روحانی موڑ پیدا کیا، اور دہلی ثانی جونپور کو سرزمین چشت بنا دیا، راجہ سید حامد شاہ حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، آپ کے والد درویش صفت بزرگ تھے، بچپن ہی ہی میں شیخ حسام الدین کی صحبت و خدمت میں رہ کر سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں، اور طریقۂ چشتیہ میں کمال کو پہنچے، اور عین جوانی میں اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے جونپور آئے، جہاں سلاطین و علماء اور عوام سب نے بڑھکر استقبال کیا، اس کا نقشہ صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"در وقت شباب ارشاد نامہ باسم وے نوشتہ بطرف جونپور رخصت، وا ور ابر مرکب سوار

[1] آئینۂ اودھ ص ۱۶۸ [2] مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ۳۶۴، مملوکہ قاضی اطہر مبارکپوری۔

ساخت، وخود بجہت مفاخرت او پیادہ ہمراہ او برآمد، تا بیرون شہر مانکپور ایں بیت کرو بزبان می راند

میروی تو در رکاب و میرود جان حسام فی امان اللہ برو، فاللہ خیر حافظا

پس چوں راجی حامد شاہ با کمال ولایت و تصرف در جونپور داخل شد، غلغلہ سید در شہر و نواحی آنجا در افتاد، و تمام خلق آں دیار روئے نیاز بدو آوردند، و اکثر بشرف ارادتش در آمدند مثل شیخ الہ داد، و شیخ بہاء الدین جونپوری وغیرہ[1]

راجہ سید حامد شاہ شیخ حسام الدین کی صحبت میں آنے سے پہلے اپنے خاندان والوں کی طرح سپاہیانہ لباس میں رہتے تھے، کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہیں تھے، مگر صفائی باطن اور روحانی فراست کا یہ حال تھا کہ فضلائے زمانہ آپ کے حلقہ میں آکر علم و معرفت سے محظوظ ہوتے تھے، خزینۃ الاولیاء میں ہے،

"و راجی حامد شاہ در اوائل حال بلباس سپاہیاں می ماند، آخر بصحبت شیخ حسام الدین مانکپوری مشرف شد، و ریاضات شاقہ کشید و صفائے باطن و حضور قلب نصیب او گردید و مے از علم ظاہر بقدر ما یحتاج کفایت کردہ بود لیکن دانشمندان دہر، و علماء عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند"۔[2]

آپ کی وفات ۲۵ شعبان ۹۰۱ھ میں مانک پور میں ہوئی اور مزار بھی وہیں ہے۔

یوں تو آپ کے بہت سے خلفاء تھے، ان میں سے پانچ بہت مشہور ہیں، جن کے ذریعہ بلاد پورب میں فیوض و برکات کا دریا جاری ہوا، (۱) آپ کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی ۹۲۱ھ (۲) مولانا شیخ حسن بن طاہر جونپوری متوفی ۹۰۹ھ (۳) مولانا شیخ الہداد جونپوری متوفی ۹۲۳ھ (۴) مولانا شیخ بہاء الدین جونپوری متوفی ۹۱۱ھ (۵) مولانا شیخ دانیال بن حسن جونپوری متوفی ۹۹۲ھ رحمہم اللہ۔

راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانکپوری متوفی ۹۲۱ھ

آپ کو نور الحق اور نور الدین بھی کہتے ہیں، مگر نور کے نام سے

[1] مشکوٰۃ النبوۃ ص ۲۱۶ [2] خزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۰۹

زیادہ مشہور ہیں، اپنے والد کے خلیفہ اور سجادہ نشین اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، جب آپ پیدا ہوئے تو راجہ حامد شاہ کے مرشد و شیخ حسام الدین نے ان کو بشارت دی کہ یہ بچہ آگے چل کر قطب وقت ہوگا، راجہ حامد شاہ نے بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور عنفوان شباب میں تمام ظاہری و باطنی علوم اور سلوک و معرفت سے بہرہ مند کر دیا، اور جب راجہ حامد شاہ کا وصال ہوا تو راجہ نور نے ان کی جگہ سنبھالی، باپ کی طرح آپ بھی امیرانہ اور سپاہیانہ لباس زیب تن فرماتے تھے، شاہ عبد الحق دہلوی لکھتے ہیں: "او نیز مثل پدر بزرگ و صاحب کرامت بود، و لباس سپاہ گری را غشاوہ حال و مشغولی باطن ساختہ"[1]، مولانا عبد الصمد ابن افضل احمد انصاری نے اخبار الاصفیاء میں لکھا ہے: "راجی نور الدین قدم ہمت در کلبۂ فقر و فنا فشردہ، چند پایہ از پدر بلند تر رفت، و چند خلفاء و مریدان یادگار گذاشتہ"[2]۔ اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاولیاء میں لکھا ہے "راجی سید نور کہ از سادات نور علی نور و اولیاء عظام است"[3]۔

راجہ سید نور شاہ نے بعہد سکندر لودی ۹۲۱ھ میں مانک پور میں انتقال فرمایا، آپ کا مزار خانقاہ مانک پور کی سرحد پر ہے، اکبر کے زمانہ میں اس پر روضہ اور گنبد تعمیر ہوا، آپ کی اولاد میں راجہ سید احمد ہیں، جن کا نام شیخ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں محمود بتایا ہے، مگر ان کے حالات نہیں ملتے،

راجہ نور کے تین خلفاء بہت مشہور ہیں، جن سے بلاد پورب میں علم و معرفت کی بہت سی انجمنیں آباد ہوئیں، (۱) شیخ دیتن بن احمد جونپوری متوفی ۹۴۴ھ (۲) شیخ جلال الدین بن صدر الدین اودھی متوفی ۹۶۵ھ (۳) شیخ نظام الدین امیٹھوی متوفی ۹۷۹ھ۔

راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور مانکپوری بانی مبارک پور

آپ راجہ سید نور کے پوتے اور راجہ سید احمد کے بیٹے ہیں، افسوس ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود آپ کے حالات

[1] اخبار الاخیار [2] اخبار الاصفیاء قلمی ورق ۸۳ مملوکہ قاضی اطہر مبارکپوری [3] خزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۰۹

نہ مل سکے، البتہ مشائخ گردیزیہ کے سلسلۂ نسب میں ان کا نام متعدد جگہ موجود ہے، مثلاً نزہتہ الخواطر میں ان کے پوتے راجہ سید احمد بن مجتبیٰ مانک پوری کے ذکر میں گنج ارشدی کے حوالہ سے یوں درج ہے:

الشیخ الصالح احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن الحامد الحسینی الصوفی المانکپوری۔[1]

شیخ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں راجہ سید مبارک کے بیٹے راجہ سید مصطفیٰ کے ذکر میں یوں لکھا ہے،

راجی سید مصطفیٰ بن سید مبارک بن سید محمود (احمد صحیح ہے) بن سید نور بن سید حامد شاہ۔[2]

نیز غوثی نے راجہ سید مصطفیٰ کے نسبتی بھائی شیخ اویس بن غوث الاولیاء کے ذکر میں راجہ سید مبارک کا نام یوں لیا ہے، "غوث، خسر مصطفیٰ بن مبارک۔[3]"

آئینۂ اودھ میں راجہ سید نور کے ذکر کے آخر میں ان کا نام یوں آیا ہے، "پسران کے (راجہ سید نور کے) سید احمد، ان کے سید مبارک، ان کے راجی سید بندگی الخ[4]"

اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء میں قصبہ مبارک پور کے ذکر میں راجہ سید مبارک کا تذکرہ یوں ہے:

"کہا جاتا ہے کہ اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، بعد میں راجہ مبارک کے نام سے آباد ہوا، جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے،[5]"

راقم الحروف کو فارسی زبان میں ایک قلمی رسالہ ملا ہے، جس سے ان کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے:

"جواب خط سید مبارک محمد آبادی کہ جناب مولانا حاجی محمد علی صاحب نوشتہ بودند ادام اللہ۔"

اس کے بعد اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

[1] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۵۹ [2] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۵۳ مطبع مفید عام آگرہ [3] ایضاً ص ۶۰۶ [4] آئینۂ اودھ ص ۲۸۲ [5] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۲۷۱

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بخدمت راجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، از طرف فقیر محمد علی عفی عنہ، بعد سلام سنت الاسلام، آنکہ سوال از اثبات امامت و وصایت کردہ بودند معلوم نمایند کہ وصایت و امامت دوازدہ امام علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام نزد اہل سنت وجماعت ثابت و متحقق ست، نہ بایں معنی کہ شیعہ می گویند بلکہ بمعنی دیگر ست، چرا کہ شیعہ لفظ امامت می گویند، و ازاں مراد نبوت می دارند، دوازدہ امام را احکام نبوت ثابت میکنند از نزول وحی و تحریم و تحلیل وغیرہ کہ در کتب ایں فرقہ مسطور است الخ" (ص ۱)

یہ رسالہ ۱۸ صفحات میں ہے، ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں، افسوس کہ اس کا آخری ورق غائب ہے، اس کی ان ابتدائی عبارتوں سے ہم حسب ذیل نتائج نکال سکتے ہیں:

جس زمانہ میں راجہ سید مبارک نے مولانا محمد علی سے زبانی یا تحریری سوال کیا تھا، اس سے بہت پہلے وہ انک پور سے آکر پرگنہ محمد آباد یا خاص قصبہ محمد آباد میں آباد اور یہاں مستقل قیام کی وجہ سے محمد آبادی مشہور ہو گئے تھے، اور غالباً قصبہ مبارک پور کو اپنے نام پر آباد کر کے یہیں رہتے تھے، اور چونکہ قصبہ مبارک پور اس زمانہ میں پرگنہ محمد آباد میں تھا، جیسا کہ اب بھی ہے، اور نیا نیا آباد ہوا تھا، اس کی کوئی خاص شہرت نہیں تھی، اس لیے وہ محمد آبادی ہی کی نسبت سے مشہور ہوئے، جس طرح اس زمانہ میں اس علاقہ کے مختلف مقامات کے علما، جونپوری مشہور ہوئے۔ اور یہ قاعدہ بھی ہے کہ کسی بڑی بستی یا شہر کے قرب و جوار کے لوگ اسی کی نسبت سے مشہور ہوتے ہیں۔

مولانا محمد علی نے اپنے جواب کی ابتدا میں ان کو راجی مبارک علی کے نام سے یاد کیا ہے، مگر انکا نام اور ہر جگہ صرف راجہ سید مبارک ملتا ہے، ممکن ہے علی کا اضافہ دیار پورب میں مستقل بود و باش کے بعد ہوا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے ہی سے بطور اختصار کے مبارک مشہور ہو گیا ہو، جس طرح ان کے دادا راجہ سید نور کا پورا نام اخبار الاصفیا میں تین مقامات پر راجی نور الدین آیا ہے،

اور نزہۃ الخواطر میں گنج ارشدی کے حوالے سے نور الحق ہے، مگر وہ صرف راجہ سید نور کے نام سے مشہور ہیں۔

اس رسالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مبارک کو علوم دینیہ سے حصہ وافر ملا تھا، اور وہ علمی و دینی مسائل و مباحث میں معاصرین سے تعلق رکھتے تھے، اور سنی المسلک تھے، افسوس کہ مولانا حاجی محمد علی صاحب کے حالات نہیں مل سکے ورنہ سائل اور مجیب دونوں کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوتے۔

راجہ سید مبارک کا سنہ وفات تک معلوم نہ ہو سکا، اور نہ ان کے دور کی تعیین ہو سکی، ان کے دادا راجہ سید نور نے سکندر لودھی کے زمانہ میں ۹۲۱ھ میں وفات پائی، اور ان کے بیٹے راجہ سید مصطفیٰ ۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ کے ہمراہ مالوہ گئے تھے، اور پوتے راجہ احمد بن مجتبیٰ بن مبارک ۱۰۴۸ھ میں فوت ہوئے۔ ان سنین وفات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راجہ مبارک دسویں صدی ہجری کے وسط میں ضرور تھے، اور اسی دوران میں انھوں نے قصبہ مبارک پور (اعظم گڈھ) آباد کیا، اور اپنے آباء و اجداد کی طرح دیار پورب میں رہنے کے باوجود مانک پور سے تعلق رکھا۔ اور وہیں انتقال کیا اور مزار بھی وہیں ہے۔

راقم الحروف کا خاندان مانک پور کا تھا، جسے راجہ سید مبارک اور مشائخ گردیزیہ سے روحانی اور دینی تعلق تھا، راجہ سید مبارک نے اس کو اپنے ساتھ لاکر مبارک پور میں آباد کیا تھا، آپ کی یادگار قصبہ مبارک پور کی جامع مسجد ہے، جو "راجہ صاحب کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے، اور اسکے علاقہ کو "راجہ صاحب" کہتے ہیں، یہ مسجد ۳۲ دروں کی تھی، اتنی بڑی مسجد اس علاقہ میں دوسری نہیں تھی، چند سال ہوئے لوگوں نے اسے منہدم کر کے اسکی جگہ دوسری عالیشان مسجد کی بنیاد رکھی جو ابتک نامکمل ہے، اس مسجد کے شمالی جانب ایک احاطہ ہے جس میں ایک قناتی دار چھوٹی سی مسجد ہے، یہی دراصل راجہ مبارک کی مسجد ہے، اسی احاطہ میں ان کی مصنوعی قبر بھی ہے، ہمارا آبائی مکان اسی احاطہ کے پاس تھا، مبارک پور آباد ہونے کے بعد دار القضاء، پرگنہ محمد آباد گوہنہ سے متعلق رہا، اور یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ راقم الحروف کے خاندان کے سپرد ہوا، اس سلسلے کے کئی شاہی فرامین اور اسناد ابتک ہمارے یہاں محفوظ ہیں، مبارک پور کے قریب ہی مغرب میں سرائے مبارک نامی ایک بستی ہے، غالباً یہ بستی بھی راجہ سید مبارک ہی کے نام پر اسی زمانہ میں آباد ہوئی تھی، مشائخ گردیزیہ نے مانک پور کے قرب و جوار میں بازید پور، اونچہ گاؤں، مصطفیٰ آباد، رسول پور اور شہاب الدین پور نامی بستیاں آباد کی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ قصبہ مبارک پور کے قریب شمال مغرب میں مصطفیٰ آباد، اور شمال مشرق میں رسول پور نامی مسلم بستیاں بھی راجہ مبارک کے دور میں آباد ہوئیں، اور مصطفیٰ آباد کا نام ان کے صاحبزادے راجہ سید مصطفیٰ کے نام پر رکھا گیا، اس طرح انھوں نے نواح مانک پور سے لیکر حدود جونپور تک اپنے روحانی فیوض و برکات کے ساتھ تعمیری آثار بھی ثبت کیے، راجہ مبارک کی اولاد کے بارے میں اعظم گڈھ گزیٹیر میں ہے:

"وہ مبارک پور کے موجودہ شیوخ زمینداروں کے مورث اعلیٰ تھے"[۵۱]

جو صحیح نہیں ہے، یہاں ان کی اولاد کے رہنے اور بسنے کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ہمارا خاندان جسے راجہ مبارک اپنے ہمراہ مانک پور سے لائے تھے، یہاں آباد ہو کر یہاں کی نیابت قضاء کا عہدہ سنبھالتا رہا، راجہ سید مبارک کے دو صاحبزادے راجہ سید مصطفیٰ اور راجہ سید مجتبیٰ کے نام اور حالات کتابوں میں ملتے ہیں، مگر ان کے مبارک پور میں مستقل قیام کی کوئی روایت یا سند نہیں ملتی۔

راجہ سید مصطفیٰ بن راجہ سید مبارک: آپ عہد اکبری کے باکمال علماء و مشائخ میں تھے، اور امارت و مشیخت دونوں میں ممتاز تھے، آئینۂ اودھ میں غالباً ان ہی کو راجہ سید مبارک کے پسر راجہ سید بندگی لکھا ہے[۲]، محمد غوثی نے گلزار ابرار میں راجہ سید مصطفیٰ کا مستقل تذکرہ کیا ہے، اور ایک جگہ ان کے نسبتی بھائی شیخ

---

۵۱ اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۶۱ ۲ آئینۂ اودھ ص ۲۸۲

ادریس بن غوث الاولیاء کے ذکر میں، غوث، خسر مصطفیٰ بن مبارک لکھا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ راجہ سید مصطفیٰ کے پدر بزرگوار کا نام سید مبارک بن سید محمود (احمد) بن سید نور بن سید حامد شاہ ہے، وہ سید حامد شاہ شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلیفۂ اعظم ہیں، راجہ مصطفیٰ کے اخلاق درویشانہ اور اطوار صوفیانہ تھے، آپ کی نزاکت طبع ناموافق چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، زندگی کمال ظریفانہ طور پر بسر کرتے تھے، ظاہری پاکیزگی اور باطنی صفائی آپ کے خمیر میں داخل تھی، سرود وسماع سے دلچسپی رکھتے تھے، مگر اس میں صرف کمال فن سے محظوظ ہوتے تھے، غوث الاولیاء کی خدمت میں دامادی کی نسبت تھی، اور قطب الاقطاب کی لڑکی سے کئی فرزند تھے، جن میں سے ایک راجہ سید محمد ہیں، جو اپنے پدر بزرگوار کے جانشین ہیں، اللہ تعالیٰ سب فرزندوں کو اجداد کے کمالات پر پہنچائے۔ ۹۸۴ھ میں عرش آشیانی اکبر شاہ کا لشکر دار الخلافہ آگرہ سے مالوہ کی طرف آیا، اور تمام مشائخ، فقراء، فضلاء، قضاۃ اور شعراء لشکر کے ہمراہ تھے، راقم (محمد غوثی مصنف گلزار ابرار) نے جب یہ خبر سنی تو بیتاب ہو کر ان کی زیارت کرنی چاہی، اور میں بھی جو بزرگان شہر (مانڈو یا برہانپور) سیر لشکر کے لیے روانہ ہوئے، ان کے ہمراہ ہو گیا، اسی سلسلے میں راجہ سید مصطفیٰ کے دیدار سے ظاہری اور باطنی آنکھیں منور ہوئیں۔[1]

راجہ سید محمد بن راجہ سید مصطفیٰ ابن راجہ سید مبارک

جیسا کہ غوثی کے بیان سے معلوم ہوا، آپ اپنے والد راجہ سید مصطفیٰ کے خلیفہ اور جانشین تھے، اور غوثی کے زمانہ میں زندہ تھے، شیخ محمد ابن حسن غوثی مندوی (ولادت مانڈو ۹۶۲ھ) نے گلزار ابرار ۱۰۱۴ھ میں لکھنی شروع کی، جو رجب ۱۰۲۲ھ میں اتمام کو پہنچی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۲۲ھ تک راجہ سید محمد حیات تھے۔

راجہ سید مجتبیٰ ابن راجہ سید مبارک

آپ راجہ سید مبارک کے دوسرے فرزند ہیں، آپ کا مستقل تذکرہ نہ مل سکا،

---

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۵۴

البتہ آپ کے فرزند راجہ سید احمد کے تذکرے سے ان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ گنج ارشدی کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں راجہ سید احمد بن مجتبیٰ مانک پوری کے ذکر میں ہے:

ولد ونشأ بمانكپور، وتفقه على	آپ (راجہ سید احمد) مانک پور میں پیدا ہوئے
والده، واخذ عنه الطريقة	اور وہیں پروان چڑھے، اپنے والد سے فقہ
ولازمه ملازمة طويلة	اور دین کی تعلیم حاصل کی، نیز ان ہی سے
ثم تصدر للارشاد والتلقين[1]	طریقہ چشتیہ حاصل کر کے مدتوں ان کی صحبت
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۶۰)	وخدمت میں رہ کر ارشاد وتلقین کے منصب پر فائز ہوئے

ان چند جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مجتبیٰ ابن راجہ سید مبارک کس پایہ کے عالم اور شیخ تھے، اور ان کو علوم ظاہری و باطنی دونوں سے کتنا وافر حصہ ملا تھا۔

راجہ سید احمد بن راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارکؒ

آپ کا تذکرہ گنج ارشدی کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں اس طرح درج ہے: "احمد بن مجتبیٰ ابن مبارک بن احمد بن نور بن حامد حسینی رضوی مانکپوری، آپ احمد حلیم کے نام سے مشہور ہیں، مشائخ چشتیہ میں سے ہیں، مانکپور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے دینی علوم حاصل کر کے ان ہی سے طریقہ چشتیہ حاصل کیا، اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہ کر ارشاد وتلقین کے میدان میں نکلے، آپ کی کشف وکرامت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، بعض تلامذہ نے اپنی کتاب الخوارق الاحمدیہ میں آپ کی کرامتوں کا ذکر کیا ہے، کبھی کبھی خود بھی اپنی کرامتوں کو بیان کیا کرتے تھے، اپنے خاندان کے شیخ الشیوخ شیخ حسام الدین مانک پوری کی ذریات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، ان کے خاندان کے بچے جب تک آپ کے سامنے کھیلتے یا سامنے سے گذرتے آپ ان کے احترام میں برابر کھڑے رہتے، حضرت شیخ دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے بہت سے مشائخ نے آپ سے طریقت ومشیخت کی تعلیم حاصل کی، حضرت دیوان محمد رشید نے

ان سے طریقۂ چشتیہ کے ساتھ طریقۂ سہروردیہ بھی حاصل کیا تھا اور ان کے خلیفہ بھی تھے، راجہ سید احمد جمادی الاولیٰ ۸۴۰ھ میں مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[1]

ہمارے خیال میں سادات گردیزیہ مانک پور کی بزم چشتیت کا یہ آخری چراغ تھا جو دیار پورب میں روشن ہوا، اور دیوان محمد رشید اور ان کے مریدین و تلامذہ کے ذریعہ اس کی روشنی بارہویں صدی ہجری تک یہاں نظر آتی رہی۔

چند اور گردیزی مشائخ

آئینۂ اودھ کے مصنف نے راجہ سید مبارک کے پوتے راجہ سید یٰسین، ان کے لڑکے راجہ سید عبدالحق اور ان کے لڑکے راجہ سید ابراہیم کے نام لکھکر لکھا ہے کہ یہ سب کے سب کامل و قابل و عامل و صاحب باطن گذرے ہیں، اور ہزارہا لوگ ان کے نور باطن سے فیضیاب ہوئے، نقل ہے کہ راجہ سید ابراہیم کے خدام جنات تھے، ان کے خلف الرشید سید میران جی، اور ان کے لڑکے سید ابراہیم ثانی تھے، ان دو پشتوں تک وہ پہلا کمال باطنی جیسا کہ چاہیے تھا، حاصل نہ ہوا، تاہم باپ دادا کی تقلید کی کوشش رہی، اور ان کے پسر سید احمد ثانی بخوف ضبطی معافی تبدیل مذہب کرکے امامیہ ہوگئے، سید احمد کے لڑکے سید غلام شاہ کے تین لڑکے تھے، میر حسن علی موضع بھمن پور میں، میر بہر علی موضع تنبی پرگنہ کڑہ تحصیل کھاگا میں، اور میر مدد علی موضع میران پور پرگنہ دلمئو میں، میر حسن علی فی الجملہ سنی تھے، باقی دونو بھائی شیعہ ہیں، اس کے بعد اس خاندان کے چند اور لوگوں کے نام ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔[2]

شیخ حسام الدین مانکپوری اور انکے صاحبزادے شیخ محمود مانکپوری بلاد پورب میں

سلاطین شرقیہ جونپور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کا دور حکومت ارباب علم و فضل کے لیے بڑا پرکشش تھا، اس کی قدردانی اور نیک نفسی کی وجہ سے جونپور دارالعلم بن گیا تھا، اور ملک کے بہت سے ارباب کمال یہاں کھنچ آئے تھے، اسی دور حکومت میں حضرت شیخ حسام الدین بن خواجہ

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۰۔ [2] آئینۂ اودھ ص ۲۰۳،

خضر بن جلال الدین عمری مانک پوری، متوفی ۸۵۳ھ نے بھی یہاں قیام فرمایا، آپ نے اپنے والد سے درسیات پڑھکر مشرق کا سفر کیا، اور حضرت شیخ نور الحق بن علاء الحق چشتی بنگالی پنڈوی متوفی ۸۱۳ھ کی خدمت میں مدتوں رہکر طریقۂ چشتیہ میں کمال حاصل کیا، مرشد نے اپنے اس مرید خلیفہ کو ۸۰۶ھ میں مانک پور جانے کی اجازت دی، اس کے بعد شیخ حسام الدین جونپور چلے آئے، اور یہاں سات سال تک نہایت فقر و فاقہ اور گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے، اس کے بعد وہ حسن قبول حاصل ہوا کہ امراء و سلاطین تک آپ کے نیازمندوں میں داخل ہوگئے اور اہل شہر نے آپ سے فیض اٹھایا، آپ ابراہیم شاہ شرقی، محمود شاہ شرقی اور محمد شاہ شرقی کے زمانے میں تھے، آپکے بعد آپ کے خلیفہ راجہ سید حامد شاہ مانکپوری نے بھی جونپور میں قیام کرکے شیخ کا فیض جاری رکھا۔

شیخ حسام الدین کے صاحبزادے شیخ محمود بن حسام الدین مانک پوری متوفی ۹۰۵ھ نے والد کے وصال کے کچھ پہلے یا بعد ۸۵۳ھ میں دیار مشرق کا رخ کیا اور جونپور سے آگے بڑھکر غازیپور کو اپنا مستقر بنایا، شیخ حسام الدین کے علم و فضل کی دھوم سے خطۂ پورب گونج ہی رہا تھا کہ ان کے صاحبزادے کی آمد ہوئی، اس لیے قدردانوں نے بڑھکر ان کا استقبال کیا، اس وقت نصیر خان لوہانی حاکم غازیپور تھا، اس نے سلطان سکندر بن بہلول لودھی سے اجازت لیکر شیخ محمود کو وہاں کا میر عدل بنا دیا۔ آپ اس منصب پر تازندگی رہے، اور ۹۰۵ھ میں غازیپور ہی میں وصال ہوا، آپنے سلاطین جونپور میں محمود شاہ شرقی، محمد شاہ شرقی، اور حسین شاہ شرقی کا زمانہ پایا، اور سلاطین لودھی میں سے بہلول لودی اور سکندر بن بہلول لودی کا دور دیکھا۔

راجہ سید حامد شاہ مانک پوری اور انکے خلفاء بلاد پورب میں

شیخ حسام الدین مانک پوری نے سات سال تک فقر و فاقہ اور گمنامی کی زندگی بسر کرکے جونپور اور خطۂ پورب کو سرزمین چشت بنایا اور ان کے صاحبزادے شیخ محمود مانکپوری میر عدل نے اپنے عدل و انصاف سے روحانیت و دیانت بخشی،

ان ہی ایام میں شیخ حسام الدین کے ۲۰ خلفاء میں سے خلیفۂ اعظم راجہ سید حامد شاہ مانکپوری متوفی ۹۰۱ھ نے بھی یہاں دین و روحانیت کی بساط بچھائی، شیخ حسام الدین نے ان کو بڑے تزک و احتشام اور فخر و مباہات کے ساتھ جونپور روانہ فرمایا تھا، اس وقت راجہ سید حامد کا عنفوان شباب تھا، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، جونپور میں آپ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دیار پورب میں شیخ حسام الدین اور ان کے صاحبزادے شیخ محمود کو جو مقبولیت ہوئی تھی، وہی راجہ حامد شاہ کو حاصل ہوئی، ہر طبقہ کے لوگ اس جانے پہچانے گھر کے نووارد مہمان کے لیے فرش راہ بن گئے، وہ درسیات کے کوئی بڑے عالم و فاضل نہیں تھے، مگر ان کی روحانیت میں وہ کشش تھی کہ بڑے بڑے فضلائے زمانہ بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں آگئے، خزینۃ الاولیا میں ہے:

"ودے از علم ظاہری بقدر مایحتاج کفایت کردہ بود، لیکن دانشمندان دہر و علمائے عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند" (ج ا ص ۴۰۹)

آپ نے سلاطین شرقیہ میں ابراہیم شاہ شرقی (غالباً) محمود شاہ شرقی، محمد شاہ شرقی اور حسین شاہ شرقی کا زمانہ، اور سلاطین لودھی میں بہلول شاہ لودی اور سکندر بن بہلول شاہ لودی کا ابتدائی زمانہ پایا، یوں تو راجہ سید حامد مانکپوری کے بہت سے خلفاء تھے، مگر بلاد پورب میں جن سے آپ کا سلسلۂ فیض جاری ہوا، اور طریقۂ چشتیہ کو فروغ ملا، وہ پانچ ہیں، (۱) آپ کے صاحبزادے راجہ سید نور (۲) شیخ بہاء الدین جونپوری (۳) مولانا شیخ الہداد جونپوری (۴) شیخ حسن بن طاہر جونپوری (۵) شیخ دانیال بن حسن جونپوری، راجہ سید نور کا مستقل تذکرہ آگے آئے گا، اس لیے یہاں باقی چار خلفاء کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

(باقی)

پوپ کا وثیقہ اور اس کا تحلیلی جائزہ

از جناب مولوی حبیب صاحب ریحان ندوی استاذ جامعہ اسلامیہ لیبیا

گذشتہ نمبر سے حضرت مسیحؑ کے ساتھ یہود کے معاندانہ رویہ، آپ کی توہین اور آپ کی مصلوبیت تک کی تفصیل معلوم ہو چکی ہے اور یہ باتیں مسیحی عقائد کے اعتبار سے اتنی روشن ہیں کہ ان کے انکار کی جرأت ناممکن ہے، اسی لیے پوپ اپنے وثیقہ میں کھل کر اس کا اعتراف نہیں کر سکے کہ یہود نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کے الفاظ تقریباً گول ہیں۔

ایک بات اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ وثیقہ صرف یہود کے لیے نہیں نکالا گیا ہے، بلکہ اس کا تعلق مسیحیت کے علاوہ دوسرے تمام ادیان سے ہے، مثلاً ہندو مذہب، بودھ مت اور اسلام وغیرہ سے، یہ وثیقہ کیوں نکالا گیا اس کی تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے،

چند اصولی چیزوں کو چھوڑ کر بہت سی چیزوں میں اسلام، یہودی مذہب، بدھ مت اور ہندو دھرم کے مقابلہ میں مسیحیت سے متفق ہے، اسی لیے ایک زمانہ میں بعض نصرانیوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ اسلام نصرانی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے۔

اسلام حضرت عیسیٰؑ کو نبی مرسل مانتا ہے، جبکہ یہود نہیں مانتے، مگر اسلام کی اس رواداری کے باوجود مسیحیت کو ہمیشہ اسلام سے بیر رہا، لیکن رفتار زمانہ کے ساتھ صلیبیوں کا انداز بدلا، اور بعض مسیحیوں کو اسلام و مسیحیت کے متحدہ اصول تلاش کرنے کی فکر ہوئی، اس سلسلے میں پوپ پیوس ۱۲ نے مشرق کے تمام کیتھلک کو اسلامی اکثریت کے ساتھ میل ملاپ پیدا کرنے کی دعوت دی تھی اور

۶ کردنیاں کا ایک بورڈ بنایا جو اسلام کا مطالعہ کرکے پوپ کے سامنے رپورٹ پیش کرے، لیکن شاید بعض خارجی اثرات نے پیوس ۱۲ کو اسلام کے بارہ میں صریح فیصلہ سے روک دیا،

پچھلے سال جب پوپ پال ششم نے اردن کا دورہ کیا تو خیال تھا کہ وہ اسلام کے بارہ میں اپنی رائے کا اظہار کریں گے، خصوصاً جیسا کہ انھوں نے قبرص کے صدر مکاریوس کو فضائے گذرنے کے دوران میں جو تار دیا تھا اس میں حواری برنابا کی تعریف کی تھی، جو گرجے کی طرف سے بالکل نئی بات تھی، لیکن یہاں بھی خارجی اثرات سے متاثر ہوکر پوپ نے صرف مسلمانوں کے بارہ میں کوئی وثیقہ نکالنے کے بجائے تمام مذاہب سے متعلق ایک تحریر نکالی جس میں آسمانی و غیر آسمانی ادیان سب کو ایک ساتھ پکارا،

اس کا مقصد تمام مذاہب کو لادینیت اور الحاد (کمیونزم) کے خلاف متحد کرنا تھا،

یہود نے اس وثیقہ اور سیاسی چالوں کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور جس طرح سرمایہ دار مغرب کا پورا ملاک یہودیت کا پاس کرتا ہے۔ اسی طرح پوپ نے بھی اپنے اس وثیقہ میں یہود کا بڑا پاس کیا ہے، اور حضرت مسیح کے سب سے بڑے دشمنوں اور مسیحیت کے سب سے زیادہ مخالفوں کے ساتھ جس رواداری کا ثبوت دیا ہے، اس کے پس پردہ ضرور کوئی ہاتھ ہے، ایسی رواداری کی مثال صلب مسیح کے بعد سے آج تک تاریخ مسیحیت میں نہیں ملتی۔

مضمون طویل ہو جانے کے باوجود پوپ کے وثیقہ کا ترجمہ کر دینا ضروری ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ پوپ نے اسلام کی بھی تعریف کی ہے، اور مسیحیوں سے التجا کی ہے کہ وہ یہود کے بارہ میں رائے بدل دیں، بعض اہم جملوں کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے، جن پر ہم بعد کو اپنا تبصرہ کریں گے، وثیقہ کا ترجمہ یہ ہے:-

"وہ قرارداد جو ہندو دھرم، بدھ مت، اسلام، یہودیت اور سارے غیر مسیحی مذاہب کے بارے میں

ویٹیکن کے پادریوں کے مجمع مسکونی ۲ کے تیسرے اجلاس میں جمعہ کے دن ۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء کو پیش کی گئی جس کو مجمع نے ۱۶۵۱ ووٹوں کی اکثریت سے پاس کیا، صرف ۹۹ ووٹ اس کے خلاف آئے، اور ۲۴۲ نے سکوت اختیار کیا، سرکاری طور پر اس کا اعلان اس لیے مؤخر کر دیا گیا تاکہ ان تحفظات کی تحقیق کی جائے جو گذر چکے۔

۱- تمہید، اس زمانہ میں جب کہ جنس بشری کی قوت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور مختلف قوموں کے درمیان تعلقات زیادہ ہوتے جارہے ہیں، کیتھلک گرجا غیر مسیحی ادیان سے اپنے تعلقات کے بارے میں گہری بحث کرنا چاہتا ہے، کیونکہ سب کے سب مل کر ایک جماعت بناتے ہیں، اور ان سب کی اصل ایک ہی، چونکہ اللہ نے ساری بشریت کو ایک زمین میں بسایا تھا، (اعمال ۱۷: ۲۶) اور اس کا مقصد بھی ایک ہے، اور وہ اللہ ہے جس کی عنایت شاملہ اور سخاوت کے دلائل اور بچانے کے مقاصد تمام بشر کے لیے ہیں (حکمہ ۱۱۸، اعمال ۱۴: ۱۷، رومانین ۲: ۶، اولی تیموتاوس ۲: ۴) اس دن تک جبکہ وہ مختارین کو مقدس شہر میں جمع کرے گا، جہاں کہ رب کا مجد روشن ہوگا، جس کی روشنی میں اقوام چلیں گی، (رویا ۲۱: ۲۳) بیشک لوگ مختلف ادیان سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ بشری زندگی کی گتھیوں کو سلجھائیں، جو کل کی طرح آج بھی ان کو پریشان کیے ہوئے ہیں، انسان کیا ہے؟ ہماری زندگی اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ حقیقی سعادت کا کون راستہ ہے؟ موت کیا ہے اور موت کے بعد قضا و ثواب کیا چیز ہے؟ ہمارے وصف سے ماورئی وہ کونسی ذات ہے جو ہمارے وجود پر محیط ہے، اور جس کے پاس سے ہم آئے ہیں، اور جس کے پاس ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔

۲- ہندو مذہب اور بودھ - ہم مختلف قدیم قوموں میں اس پوشیدہ قوت کی معرفت کی روشنی دیکھتے ہیں، جو تمام موجودات اور حیات بشریہ کے حوادث میں ساری ہے، یہانتک کہ انھوں نے

اللہ کی ذات کو بھی جان لیا تھا، جو سب کا باپ ہے، اس لیے یہ قدیم مذاہب جن کی ثقافت قدیم اور زبانیں ترقی یافتہ ہیں، ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں،

ہندو اسرار الٰہی کو تلاش کرتے اور اس کی تعبیر ہندو میتھالوجی کے ذریعے، نہ ختم ہونے والے قصوں سے بھی کرتے ہیں اور بلند فلسفیانہ افکار سے بھی، وہ زہد، ترک دنیا، گہرے غور و فکر اور محبت الٰہی کے ذریعے آلام دنیا سے چھٹکارے کی راہ تلاش کرتے ہیں،

اسی طرح بودھ مذہب کے پیروؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ نیرنگ دنیا بشریت کی سعادت سے عاجز ہے، اس لیے وہ ایسا راستہ سکھاتے ہیں جس کے ذریعے آلام دنیا سے آزادی حاصل کر کے کامل راحت و سکون کی زندگی تک پہنچ جائیں، یہ عبادت، اللہ تعالیٰ پر اعتماد، پاکیزگی اور فانی چیزوں سے بے نیازی کا راستہ ہے،

بہر حال دنیا میں جتنے مذاہب بھی ہیں، وہ مختلف طریقوں سے بشریت کے اس درد کے علاج کے لیے کوشاں ہیں، اور ان کی تعلیمات میں زندگی کا دستور اور مقدس رسوم ہیں، کیتھلک گرجا ان میں سے کسی بات کو بھی برا نہیں سمجھتا جو ان ادیان میں صحیح اور مقدس مانی جاتی ہیں، اور برابر مسیح کی یہ بشارت دیے جاتا ہے جو کہ "راہ حق اور زندگی ہیں"۔ (یوحنا ۱۴ : ۶) اور اللہ نے ان کے ذریعے عالم سے صلح کر لی ہے (کورنتھس ۵ : ۱۹)

اور چونکہ گرجا چھٹکارا کے مختلف طریقوں سے واقف ہے (القدیس ایرفاوس ضد البدع ۴: ۲۸)

اس لیے وہ پوری رواداری کے ساتھ ان تمام طریقوں کو دیکھتا ہے، جن کے سلوک، زندگی، دستور اور تعلیمات میں نور حقیقت کی تھوڑی سی چنگاری بھی ہے، جو بشریت کو روشن کر سکے، خواہ ان میں تھوڑا بہت اختلاف ہی کیوں نہ ہو، اس لیے گرجا اپنے ماننے والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ محبت اور تعاون کے ساتھ دوسرے مذاہب کے مومنوں کے ساتھ رہیں کیونکہ یہ مذاہب بھی روحانیت اور اجتماعی و ثقافتی

قدروں کے حامل ہیں،

۳۔ مسلمان۔ گرجا مسلمانوں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو حی و قیوم و قادر خدا کی عبادت کرتے ہیں، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جس نے بشر سے گفتگو کی، وہ خدا جس کے احکام بعض اوقات پُر اسرار ہوتے ہیں لیکن دل سے ان پر خضوع واجب ہے، جس طرح ابراہیم نے اللہ کے لیے خضوع کیا، وہ ابراہیم جس کی طرف مسلمان منسوب ہیں، وہ اگرچہ مسیح کو الٰہ (خدا) نہیں مانتے، لیکن ان کی تکریم نبی کی طرح کرتے ہیں، اور ان کی ماں مریم عذرا کا احترام اور ان کی طرف وسیلہ کرتے ہیں، یوم آخرت کا انتظار کرتے ہیں، جس دن اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا، اور نماز روزہ کے ذریعہ اللہ سے تقرب کرتے ہیں، اور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ شخصی، عائلی اور اجتماعی زندگی باادب ہو کر اللہ کے لیے گذار دیں۔

اگرچہ ماضی میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان اختلاف اور دشمنی رہی لیکن گرجا کی مجلس فریقین کو ترغیب دیتا ہے کہ ماضی کو بھول کر مستقبل میں پورے اخلاص سے آپس میں مفاہمت اور ساری بشریت کے لیے دونوں ساتھ ساتھ ترقی کریں، اور اس اتحاد و اتفاق کے ذریعہ نیکی اور بھلائی پھیل جائے، اور ساری دنیا میں عدل و انصاف قائم ہو جائے

۴۔ یہود مجمع مسکونی جو کہ گرجا کے راز سے اچھی طرح واقف ہے، جانتی ہے کہ عہد جدید کی قوم اور ابراہیم کی نسل سے اس کا کیا رابطہ ہے، مسیحی گرجا جانتا ہے کہ اس کے ایمان و انتساب کی جڑیں اس کے آباء ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ اور دوسرے انبیاءؑ سے متصل ہیں، اور یہ اعلان کرتا ہے کہ تمام مسیح پر ایمان لانے والے ایمان کے ذریعہ ابنائے ابراہیمؑ ہیں (غلاطہ ۳ : ۷) اور ان کی دعوت خاص کے وہ بھی مخاطب ہیں، اس لیے گرجا یہ نہیں بھول سکتا کہ اس نے عہد عتیق کی وحی کو اس شعب کے ذریعہ تسلیم کیا جس کو اللہ نے اپنی رحمت فائقہ سے چاہا، اور گرجا یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ

وہ غذا حاصل کرتا ہے، اس خالص زیتون کی جڑ سے جس کی بری شاخوں نے طمع کی (رومانین ۱۱: ۱۷) کنیسہ حقائی ایمان رکھتا ہے کہ مسیح نے جو ہمارے سلام ہیں، انھوں نے اپنی مصلوبیت کے ذریعے یہود سے اور دوسری قوموں سے مصالحت کر لی، اور دونوں کو ایک قوم بنا دیا (افسس ۲: ۱۴)

گرجا یہ بھی جانتا ہے کہ رسول شیبب یہودی میں سے پیدا ہوئے، اور وہ گرجا کے اساس اور ستون تھے، اور اسی طرح مسیح کے تلامذہ جنھوں نے انجیل کو دنیا میں پھیلایا، اور یہود اگرچہ کہ ان کا بڑا گروہ انجیل کو نہیں مانتا، لیکن وہ جیسا کہ رسول نے کہا اپنے آباء و اجداد کی وجہ سے اب تک اللہ کے محبوب ہیں، (رومانین ۱۱: ۲۸) کیونکہ اللہ کی بخشش اور اس کی دعوت بلا ندامت کے ہوتی ہے۔

گرجا انبیاء و رسل کے ساتھ رب کے اس دن کے انتظار میں ہے جس دن اللہ تمام قوموں کو ایک آواز سے بلائیگا، اور وہ اللہ کی خدمت کے لیے متفق ہوں گے (اشعیا ۶۶: ۲۳، مزمور ۶۵: ۴، رومانین ۱۱: ۲۲)

مجلس گرجا جانتی ہے کہ مسیحیوں اور یہودیوں کے درمیان ایک مشترک عظیم میراث ہے، اسلیے وہ چاہتی ہے کہ یہ دونوں تحریروں، لاہوتی بحثوں اور برادرانہ گفتگوؤں کے ذریعہ آپس میں تعارف اور تعلقات پیدا کریں اور مجلس ایک دوسرے کی مذمت اور تہمت تراشی کو بری نگاہ سے دیکھتی ہے اور یہودیوں کے ساتھ دشمنی اور ماضی میں ان پر جو ظلم ہوا اس پر افسوس ظاہر کرتی ہے۔

اس لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ عیسائی اپنی تعلیمات کی شرح اور مواعظ میں کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے مومنین کے دلوں میں یہود کے ساتھ بغض و کراہت پیدا ہو، اور ان سے یہ کہا جائے کہ وہ مردود، ملعون اور قتل اللہ کے مجرم ہیں، اس لیے کہ مسیح کو جن آلام سے گذرنا پڑا ہے، ان کا الزام سارے یہودیوں پر نہ لگانا چاہیے، کم از کم اس وقت کے عوام جانتے ہیں کہ گرجا کا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ مسیح نے خوشی اور رضامندی کے ساتھ ان آلام اور موت کے لیے اپنے کو پیش کیا تھا،

تاکہ وہ اپنی غیر متناہی محبت سے ساری بشریت کی خطاؤں کا کفارہ ادا کریں، اس لیے گرجا کو چاہیے کہ لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں کہ صلیب مسیح اللہ کی محبت کی علامت اور تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔

۵۔ تفرقہ بالکل نہیں۔ اللہ کا علاقہ انسان کے ساتھ اس حیثیت سے کہ وہ سب کا باپ ہے اور انسان کا تعلق اپنے بھائی انسان سے اس طرح مربوط ہے کہ "جس نے اپنے بھائی سے محبت نہیں کی اس نے اللہ کو نہیں جانا۔" (یوحنا ۴: ۸) (لوقا ۱: ۲۵)

اس لیے مسیحیت میں کسی ایسے نظریہ اور ایسے طریقے کی گنجائش نہیں ہے، جو انسانوں کے درمیان یا ایک جنس اور دوسری جنس کے درمیان ان چیزوں میں تفریق کرے جن کا تعلق انسانی شرافت اور انسانی حقوق سے ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ تمام انسان خصوصاً مسیحی ہر قسم کے تفرقے اور ہر اس ظلم سے باز رہیں جو کسی انسان پر اس کے رنگ، مرتبہ اور دین کی وجہ سے کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مجلس پطرس اور پولس رسول کی تقلید کرتی ہے، اور تمام مسیحی مومنوں کو دعوت دیتی ہے کہ "وہ تمام امتوں سے اچھے تعلقات قائم کریں۔" (پطرس ۲: ۱۲) اور جس طرح کہ پولس الرسول نے کہا کہ "تم مسالمت کرو سب لوگوں سے جس قدر ممکن ہو تاکہ تم سچے طور پر اپنے اس باپ کے بیٹے بنو جو آسمانوں پر ہے۔ (رومانین ۱۲: ۸، متی ۵: ۴۴)

یہ وثیقہ کے متن کا ترجمہ ہے۔ آیندہ سطور میں اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے،

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ سرکاری طور پر اس اعلان میں تاخیر کی گئی، اس لیے کہ ۹۹ ووٹ اس کی مخالفت میں آئے، ۲۴۲ ارکان نے ووٹ نہیں دیا، اس کا سبب اسلام، بودھ مت اور ہندو مذہب کے بارہ میں وثیقہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ صرف یہودیوں کے بارہ میں اختلاف تھا، کیونکہ ان سے نفرت اور دشمنی ہر مسیحی کے دل میں پیوست ہے،

۲۔ کیتھولک گرجانے قدیم مذاہب کی صرف ان چیزوں کا اعتراف کیا ہے جو اس کے نزدیک بھی مقدس اور سچی ہیں،

۳۔ وثیقہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسیح کی بشارت یعنی مسیحی مشنریوں کیلئے تبلیغ کا دروازہ کھل جائے۔

۴۔ مسلمانوں کے لیے وثیقہ نے سب سے اچھے الفاظ استعمال کیے ہیں،

۵۔ مگر مسلمان مسیح کو خدا نہیں مانتے، یہی تو اسلام کا امتیازی وصف ہے، کہ خدا کے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے

۶۔ مسلمان مریم کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کو وسیلہ نہیں بناتے، پختہ مسلمان تو کسی کا بھی وسیلہ اختیار کرنا شرک خفی سمجھتا ہے، وہ قیامت میں صرف رسول خدا کی شفاعت کا متمنی ہے، دنیا میں خدا سے بلا کسی واسطے اور وسیلہ کے مانگتا ہے، ان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ "تجھی سے مانگتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں، (فاتحہ ۴) "جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے پوچھیں تو میں قریب ہوں، مانگنے والے کی مانگ کو سنتا ہوں، تو مجھی سے صرف مانگو۔" (بقرہ ۱۸۶) مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے تقرب کا سب سے بڑا وسیلہ عمل صالح ہے،

۷۔ مسلمان ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہیں جس طرح کہ یہود و نصاریٰ" لیکن نسبت کے اس اشتراک کی بنا پر کوئی متحدہ دین نہیں بن سکتا جب تک ابراہیمؑ والی توحید پر سب متفق نہ ہوں، مسیح کا تو قول ہے کہ ابراہیم جیسے کام کرو تو ابراہیم والے بن سکتے ہو (یوحنا ۸: ۳۹) اسی توحید کی وجہ سے ابراہیم کو امامت دی گئی تھی، اس لیے ابراہیم کی اولاد میں بھی جو شرک میں مبتلا ہوگا اس سے امامت چھین جائے گی، حضرت عیسیٰؑ کی زبان میں "ملکوت اللہ تم سے لیکر دوسروں کو دیدیا جائے گا۔" (متی ۲۱: ۴۲-۴۳) اور قرآن کا ارشاد ہے "خدا نے کہا کہ میں تجھکو لوگوں کے لیے امام بناؤں گا،" تو ابراہیم نے کہا اور میری اولاد، تو خدا نے کہا کہ میرا عہد ظالم نہیں پا سکتا" (بقرہ ۱۲۴) اس لیے اولاد ابراہیم میں جو حنیف ہوگا

وہی اس امامت کا مستحق ہوگا، "ابراہیم نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی بلکہ اطاعت گزار حنیف تھے،" (آل عمران ۶۷) اس کے قبل کی آیت میں کہا گیا ہے کہ "اے اہل کتاب ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو، اور توراۃ و انجیل تو ان کے بعد آئی (آل عمران) اس لیے دین ابراہیمی میں کسی ایسے متحدہ دین کی گنجائش نہیں ہے جو توحید اور شرک وغیرہ متضاد عقائد سے مرکب ہو.

۸۔ پوپ صاحب نے اسلام کی تعریف کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اسلام کے بارے میں پوپ اربن دوم کے زمانہ کے خیالات اور صلیبی افسانہ نویسوں اور شعرار کی افتراپردازیوں کا دور ختم ہوگیا بقول انگریز مورخ ولز اور فرانسیسی اہل قلم ہنری ڈی کاسٹری یہ ماننا پڑا کہ مسلمان سے بڑھکر موحد قوم دنیا میں نہیں.

۹۔ یہود کے متعلق پوپ بلکہ "ویٹکین کی مجلس مقدس" سے کئی چیزیں جواب طلب ہیں، پوپ نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمان مسیح کو نہیں مانتے ہیں اور مریم عذرا کی تکریم کرتے ہیں،

۱۔ کیا یہود بھی حضرت مسیح کو نبی سمجھتے ہیں؟ یا نعوذ باللہ انیس الشیاطین (متی ۱۲: ۲۴) یا کفر بولنے والا (متی ۲۶: ۶۵) یا فریبی و دغاباز (متی ۲۷: ۶۳)

۲۔ نیز مریم عذرا کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ ان پر کیسا بہتان عظیم باندھتے ہیں (نساء) ان دونوں باتوں کو وثیقے میں بالکل گول کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اگر مسیح نے اپنی مصلوبیت سے یہود سے مصالحت کرلی، تو کیا یہود نے بھی اس مصالحت کو قبول کرلیا،

۴۔ اور وثیقہ کا یہ جملہ تو حیرت انگیز ہے کہ "اگرچہ ان میں کا بڑا گروہ انجیل کو نہیں مانتا لیکن وہ آبار کی وجہ سے اللہ کے محبوب ہیں۔

جب یہ گروہ انجیل کو نہیں مانتا اور مسیح و مریم کو نہیں مانتا تو اس سے مصالحت کی بنیاد

کیا ہو سکتی ہے، اور جو گروہ انبیاء کو نہ مانے، ان کو قتل اور ان کی کتابوں کا انکار کرے وہ مومن کیسے ہو سکتا ہے،

پھر جب آباء کی خبر کی وجہ سے انکار مسیح اور قتل انبیاء کے باوجود بھی یہود محبوب ہیں تو شرمیں میں بھی ان کی اولاد کو اپنے آباء کی وجہ سے ماخوذ ہونا چاہیے، جیساکہ مسیح نے کہا تھا کہ "ہابیل مقدس کے خون سے زکریا بن برخیاہ تک کا خون اس نسل کی گردن پر ہوگا۔" (لوقا ۱۱: ۵۱) خود یہود کے زعماء نے بھی کہا ہے کہ "اس کا خون ہم پر اور ہماری اولادوں پر ہوگا۔" (متی ۲۷: ۵)

پھر آباء سے کون آباء مراد ہیں، جسدی باپ یا روحانی باپ حضرت مسیحؑ نے ان کے آباء کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، شاید مجمع مقدس کی نظر سے بھی گذرا ہوگا کہ "تم ایک باپ سے ہو جو ابلیس ہے اور تمہارے اس باپ کی شہوات کو تم پورا کرنا چاہتے ہو (یوحنا ۸: ۴۴) اور یہ کہ اگر تم ابراہیم کی اولاد ہوتے تو ابراہیم جیسے عمل کرتے (یوحنا ۸: ۳۸)

اور مسیح کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی کہ

اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو تم جہنم کی آگ سے کیونکر بھاگو گے، اس لیے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں کو اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجوں گا تم ان میں سے بعضوں کو قتل کروگے اور صلیب پر کھینچو گے اور بعضوں کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے، اور شہر بہ شہر ستاؤ گے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ (متی ۲۳: ۳۳-۳۴-۳۵)

ان برائیوں کے بعد یہود ملکوت الٰہی کے مستحق کہاں باقی رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے مشرق و مغرب سے اٹھیں گے اور ابراہیم و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کے ساتھ ملکوت آسمانی میں بیٹھیں گے، لیکن ملکوت کے بیٹے تو وہ خارجی ظلمت میں پھینک دیے جائیں گے، اسوقت رونا ہوگا، اور انسان کی آواز۔" (متی ۸: ۱۱-۱۲)

۱۰۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ یہود کا دعویٰ تھا

نَحنُ ابناء اللّٰهِ وَاحبّاؤُہ قل فلم	ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، آپ
یعذّبکم اللّٰہ بذنوبکم بل انتم	کہہ دیجئے کہ پھر اللہ تمہارے گناہوں کی سزا میں
بشرٌ ممن خَلق	تم کو کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم بھی دوسری
(مائدہ)	مخلوقات کی طرح ایک معمولی انسان ہو،

یعنی عذاب اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے بیٹے اور محبوب نہیں، اس لیے کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو گناہ اور تاریکی میں نہیں چھوڑتا اور نہ عذاب دیتا ہے، بلکہ تم بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہو اور تم پر بھی خدا کے فیصلے اسی طرح نافذ ہوں گے جس طرح دوسرے انسانوں پر نافذ ہوتے ہیں، جب تک تم عہد میثاق پر قائم رہو گے تو خدا کے خاص بندوں میں شمار رہو گا، جیساکہ توراۃ میں ہے:

"اگر تم میرے عہد کی حفاظت کروگے تو خاص ہو جاؤگے۔" (خروج ۱۹: ۵)

قرآن بھی کہتا ہے

انی معکم لئن اقمتم الصّلوٰۃ	اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے
وآتیتم الزکوٰۃ وآمنتم برسلی	رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے تو میں
(مائدہ ۱۲)	تمہارے ساتھ ہوں۔

لیکن اگر کفر میں مبتلا ہوئے اور میرے احکام کی تعمیل نہ کی تو گمراہ ہو جاؤگے (ایضاً)

یہود کی عزت ملکوت الٰہی کی بنا پر تھی، جب وہ چھن گیا تو عزت بھی چھن جائے گی اور ملکوت ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے، حضرت مسیحؑ کا ارشاد ہے

"ملکوت الٰہی تم سے چھن کر ایسی امت کو دیا جائے گا جو اس پر عمل کرے گی۔" (متی ۲۱: ۴۲-۴۳)

ان صریح احکام کے بعد یہودیوں سے کس طرح مصالحت ہو سکتی ہے، اگر مسیح کا قول سچا مانا جائے

یا ان کے نائب پوپ کے حکم پر عمل کیا جائے، جب تک انجیل کا کوئی نسخہ دنیا میں باقی ہے اس وقت تک مسیحی یہودیوں کے عقائد و اعمال کو نہیں بھول سکتے۔ اور پوپ اور مجمع مقدس کی کوششوں کے باوجود آج بھی حضرت مسیح، آپ کے پیغام اور آپ کے پیروؤں کے بارہ میں یہودیوں کے عقائد وہی ہیں جو پہلے تھے۔

غداری کی وجہ سے قتل مسیح کا جرم ہلکا ہو جانا بھی عجیب و غریب بات ہے، مسیح کا قول ہے کہ "ابن انسان سپرد کیا جائے گا جیسا کہ لکھا ہے، لیکن اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جس کے ذریعے ابن انسان سپرد کیا جائے" (متی ۲۶ : ۲۴) اسی طرح مسیح کا قول پیلاطس سے "جس نے تجھے میرے سپرد کیا اس کے لیے سب سے بڑی خطیہ ہے" (یوحنا ۱۹ : ۱۱) اور پیلاطس کو سپرد یہود کے رئیس الکہنہ نے کیا تھا۔

۶۔ ماضی میں یہود سے جو عداوت تھی گرجا نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کی ابتدا خود یہود نے کی، حضرت مسیح اور دوسرے انبیاء کے ساتھ، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اور آخر میں جرمنی کی پہلی جنگ میں یہودیوں نے جرمنوں کے خلاف بغاوت کی اور ان کے ساتھ جرمنوں نے جو کچھ کیا، وہ خود ان کی غداری کا نتیجہ تھا، مگر یہ حیرت ہے کہ اسرائیل عربوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے، اس کا اشارہ بھی وثیقہ میں نہیں ہے۔

اس کے بعد وثیقہ میں اتحاد و امن کی جو دعوت دی گئی ہے، اس کا یہ جملہ کہ ان چیزوں میں تفریق نہ ہونی چاہیے جو انسانی حرمت و حقوق سے متعلق ہیں، جہاں تک عقائد و ایمانیات کا تعلق ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس میں اختلاف اور خیر و شر باقی رہیں گے، ورنہ کیا انسانی اخوت کے لیے پوپ الحاد و کمیونزم کو قبول کر سکتے ہیں، دوسروں کے ساتھ انصاف، کسی کو حقیر نہ سمجھنا یہ سب الگ چیزیں ہیں، لیکن ان کے حاصل کرنے کے لیے ایمانی قدروں کو بدل دینا، دین کے

اصولوں میں تحریف کرنا، اور دین کے دشمنوں سے دوستی کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

۸۔ البتہ کسی کے ساتھ محض مذہب، قومیت اور نسل کے اختلاف کی بنا پر ظلم و زیادتی نہ ہونی چاہیے اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے اور یہ تعلیم اس نے اس وقت دی تھی جب رومن امپائر انسانی جانوں سے ہولی کھیل رہا تھا، اور شارلیمان مختلف قوموں کو بزور شمشیر مسیحی بنا رہا تھا، اور آپس کے لامذہبی جھگڑوں کی وجہ سے خود مسیحی ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو رہے تھے، حالانکہ مسیح کی تعلیم یہ تھی کہ "جو تلوار لیتے ہیں وہ تلوار ہی سے ہلاک کیے جاتے ہیں، (متی ۲۶ : ۵۲) اور انسان سے محبت خدا سے محبت کا رابطہ ہے۔ (یوحنا ۴ : ۸)۔ اس وقت اسلام نے رنگ و نسل کا فرق مٹا دیا تھا، اور مصریوں کے رب، اسرائیلیوں کے رب اور بنی اسرائیل کے نبی کی تفریق کو مٹا کر ایک رب العٰلمین اور رحمۃ للعالمین کی صدا بلند کی تھی۔

بہر حال وثیقہ کا لفظ لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ یہود کی سرشت اور تاریخ مسیحیوں کے نزدیک کیا ہے، اس لیے اس کو بدلنے کی کوشش کرنا بے سود ہے، البتہ اگر پوپ کی دعوت کو مسیحی حکومتیں سن لیں تو دنیا کا نقشہ بدل جائے اور اس کا سارا فتنہ و فساد ختم ہو جائے۔ صرف ان برأت ناموں اور فتووں سے ملکوت اعلیٰ کے فیصلوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور نہ اسلامی دنیا میں اس کا کوئی اثر ہو سکتا بلکہ خود مسیحی دنیا بھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگی۔

ضمیری اصفہانی یا "خسرو ثانی"

از ڈاکٹر ام ہانی فخر الزماں ایم اے، پی ایچ، ڈی ڈی لٹ، ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کمال الدین ضمیری دسویں صدی ہجری کے مشہور فارسی گو شعرا میں ہے، چونکہ اس کا باپ اصفہان کے باغ "نقش جہاں" میں باغبان تھا، اس لیے اوائل شاعری میں وہ "باغبان" تخلص کرتا تھا، بعد ازاں شاہ طہماسپ کی ملازمت میں جب اس نے علم رمل میں مہارت حاصل کر لی تو شاہ کے حکم کے بموجب ضمیری تخلص اختیار کیا، ایک مرتبہ جب شرف جہاں قزوینی کو اس سے رقابت پیدا ہوئی تو اول الذکر نے اس کی باغبانی کی طرف اشارہ کیا،

من بدان بچۂ باغبان مانم کز عشق تو خوشہ چیں باشد

جب ضمیری تخلص کرنے لگا تو اس سے ضمیری ہمدانی کا ذکر کیا گیا، جواب دیا مضائقہ نہیں، میں اتنے اچھے اشعار کہوں گا کہ وہ پامال ہو جائے گا، اور یہ نوبت آئے گی کہ لوگ اس کے اچھے اشعار مجھ سے اور میرے برے اشعار اس سے منسوب کریں گے، ایک روز طہماسپ شاہ کے دربار میں امیر خسرو کا ذکر ہو رہا تھا، شاہ نے ضمیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارے یہاں بھی ایک خسرو نادرہ گو" موجود ہے، اس کے بعد وہ خسرو ثانی کے نام سے مشہور ہو گیا،

تقی الدین کاشی کا بیان ہے کہ بعض اساتذہ کے دواوین جن کے جواب ضمیری تکمیل کو نہ پہنچا سکا، ملا میرک المتخلص بداعی نے مکمل کیے جو اس کا بیٹا تھا، لیکن تقی اوحدی کا بیان ہے کہ اس نے باپ کے کلام کو ایک حلوائی کے یہاں گرو رکھ کے اسکی قیمت افیون میں

صرف کر دی، نیز یہ کہ ضمیری اصفہانی اور محتشم کاشی میں دوستانہ تعلقات تھے، لیکن اس کی وفات (۹۷۳ھ) محتشم نے ہجو آمیز تاریخ وفات کہی اور اصفہان میں ضمیری کے پسماندگان کے پاس تعزیت کے لیے گیا، ایک روز ضیاء الدین کرمانی کے مکان پر ضمیری کی یاد میں ایک مجلس تھی، محتشم بھی وہاں پہنچے، لوگوں نے مذکورۂ بالا ہجو کے انتقام میں اس کی انتہائی تذلیل و تحقیر کی اور اس میں امیر روزبہان صبری نے نمایاں حصہ لیا، محتشم رنجیدہ ہو کر کاشان بھاگ گیا:

ضمیری کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ای عہد شکن آنہمہ صحبت بکجا رفت آن آبستن پیمان محبت بکجا رفت

خوی کردہ رخ از تشنۂ دیدار چہ پوشی ما ہیچ نگوئیم مروت بکجا رفت

ولہ

مست بگذشتی و از خلوتیان ملکوت بتماشای تو آشوب قیامت برخاست

ولہ

میکشد سرو قدت را امروز آرزوی کہ بدیدار تو دارم امروز

آنچہ دوشینہ بمن حسرت دیدار تو کرد بدعا آہ! اگر دست برآرم امروز

ولہ

پیش نظر چہ آورم وعدۂ لطف یار را ذوق وصال طے کند صد شب انتظار را

ولہ

حیرتی دارم بکار خود کہ در پیش نظر نیست رخساری و حیرانم نمیدانم چرا؟

(خلاصۃ تراجم خلاصۃ الاشعار و عرفات عاشقین)

ولہ

آنچہ می بینم بروی نیست یاروی دگر ورنہ میدادم بحیرت دل بہ بدخوی دگر

زان ہمہ خواری کہ آمد بر من از عشقت نماند پای رفتن زآستانت بر سر کوی دگر

ولہ

دل بکوی یار و من از یار دور افتادہ ام او بدل نزدیک و من بسیار دور افتادہ ام

ولہ

دلا! چرا ہمہ عمر در فنائیم کجا در خاطر آن مہ در آئیم

نشستہ گرد خواری برخ از عشق — بچشم غیر ازاں کم می نمائیم

در وصلش زنم ہر دم ضمیری — کہ تا بر خود بلا را در کشائیم

وله

شبہای مہ کہ حرف ز روی نکو زند — گوہم حدیث روی تو تا مہ فرو زند

(تحفۂ ساقی)

آذر کا خیال ہے کہ ضمیری نے کمیت شعر کا جو اہتمام کیا وہ اگر کیفیت میں بھی کرتے تو بہتر ہوتا، پھر تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے چھ مثنویاں بنام "ناز و نیاز" و "بہار و خزاں" و "لیلی و مجنوں" و "وامق و عذرا" و "حسنۃ الاخیار" و "اسکندر نامہ" لکھی ہیں، ان کے علاوہ حسب ذیل دو دواوین غزل لکھے ہیں:

"سفینۂ اقبال" و "صورت حال" و "کنز الاقوال" و "عشق بیزوال" و "صیقل ملال" و "عذر مقال" و "قدس خیال" اور اساتذۂ سلف کے جواب میں:

طیبات و بدائع و خواتیم و غزلیات قدیم شیخ سعدی "ظاہرات" و "صنائع و بدائع الشعر" و "نہایت السحر" و "عیون الزوال" دیوان خواجہ حافظ شیرازی کے جواب میں اور "سحر حلال" دیوان آصفی مروی کے جواب میں اور "خجستہ فال" شہیدی قمی کے جواب میں "لوامع الخیال" ہمایوں اسفراینی کے دیوان کے جواب میں "بدایۃ وصال" مرزا اشرف قزوینی کے جواب میں و "منتہای کمال" کمال خجندی کے جواب میں و "معشوق لایزال" امیر خسرو کے جواب میں و "حسن آل" حسن دہلوی کے جواب میں لکھے، اور آخر میں ایک چبھتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ دیا کہ جہاں تک اس کو معلوم ہے ضمیری کتابیں پڑھنے کی بھی قابلیت نہیں رکھتا تھا "پڑھنا لکھنا تو در کنار"۔ (آتشکدہ ص ۱۷۱)

نفائس المآثر میں تحریر ہے کہ "ضمیری اصفہانی قوت طبع و زور شعر دارد"۔ یہ دیوان

دس ہزار اشعار سے زیادہ کا حامل ہے، علم ریاضی میں استاد البشر میر غیاث الدین منصور کا شاگرد تھا، اور حسب ذیل اشعار اس سے منسوب کیے ہیں:

گرفتم ہما بکنج صبر و بستم دیدہ از رویت — نہادم دست بر دل پا کشیدم از سر کویت

وله

ز بسکہ حسن فزود و غمش گداخت مرا — نہ من شناختم او را نہ او شناخت مرا

وله

بآنکہ سوز غیر از جام روکان از ہوس باشد — چو آتش در خس افتد شعلۂ او یک نفس باشد

وله

کاشکی افزوں شود ہر لحظہ استغنای او — تا ز سر بیروں کنند اہل ہوس سودای او

وله

چو می بینم کسی کز کوی او دلشاد می آید — فریبی کاول از وی خوردہ بودم یاد می آید

وله

فریاد از آں لحظہ کہ در دلم آں شوخ — پرسد ز من و قوت گفتار نباشد

وله

ز خانہ دیر مہ من از آں بروں آید — کہ بوالہوس ز رہ انتظار بر خیزد

گشتہ باطرف مانع و نامد بروں از خانہ ای — شد گرہ در جانم از ہر قطرہ ای صد آرزو

وله

فراموشم ز یادش بخت آنم کو کہ بدگوئی — کند تحریک آزار من و از من دہد یادش

وله

شود از خواب چوں بیدار و بیند روی در رویم — بہانہ چشم مالیدن کند تا ننگرد سویم

ملا ضمیری اپنے بیٹے داعی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے دو بار مجھ سے تحسین حاصل کی وہ اشعار یہ ہیں:

آمدی، رفت ز دل صبر و قرارم بنشیں — بنشیں تا بخود آید دل زارم بنشیں

وله

آں فراموش وعدہ را قربان شوم کاندر رہی — ببندم از شرمساری وعدۂ دیگر دہد

نسخۂ علی گڑھ میں درج ہے (جس کی کسی اور نسخہ سے تائید نہیں ہوتی) کہ مولانا ضمیری نے ۹۸۵ھ میں اصفہان میں انتقال کیا۔

نفائس المآثر نے اس زمانہ کے ایک اور ضمیری کا ذکر بھی کیا ہے، جو ملا حیرانی کا لڑکا اور

اور قم کا رہنے والا تھا، تحفۂ ساقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضمیری نے امیدی کے اس مصرع پر

ای تو سلطانِ ملکِ زیبائی

شاہ طہماسپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

آہم از بیکسی و تنہائی — آہ ازین بیکسی و تنہائی
کر دلالی وافسکشی صدبار — بہتر از شاعری و ملائی

مقربانِ درگاہ کی تعریف میں کہا:

ہمہ حافظ فلاں ما ہیچ — ہمہ درویش رمز بغرائی

شاہ طہماسپ نے قتل کا حکم دیا لیکن قاضی جہان کی حکمت عملی سے اس کی جان بچ گئی، اس کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

من برادی مردم و مجنون بجیٔ ای ابر غم — گریہ بر من کن کہ مجنوں نوحہ گر دارد بسی
گریۂ من سوز و سوزم گریہ آرد زدرد — ولہ — درد مندم گریہ و سوزم اثر دارد بسی
میرد ی جلوہ کناں بیخبر از اہل نظر — ردش مردم ایں شہر چنین است مگر

(نفائس المآثر)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعرا (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور انکے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے۔ ضخامت ۲۶۸ صفحے، قیمت للعہ

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب طالب جے پوری

کچھ زیر لب وہ آج جو فرما کے رہ گئے — اک کیف تھا کہ روح پہ برسا کے رہ گئے
جب بن پڑی نہ چشم تمنا کے روبرو — "کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے"
کچھ شکوہ سنجِ تلخیٔ جور و ستم رہے — کچھ چشمِ التفات سے گھبرا کے رہ گئے
جو ان کی باز پرس ہوئی مجھ سے مدتوں — شکوے زبانِ حال پہ جو آ کے رہ گئے
اپنی نگاہِ شوق سے نادم ہوں کس قدر — ملتے ہی آنکھ آج وہ شرما کے رہ گئے
دعوے بہت تھے محرمیٔ راز کے جنھیں — کچھ عقدۂ حیات وہ سلجھا کے رہ گئے
ان پہ بھی اک نگاہِ کرم اے گدا نواز — دامن جو تیرے سامنے پھیلا کے رہ گئے
طے کر چکے تھے دار و رسن کی جو منزلیں — کچھ دور وہ بھی ساتھ مرے آ کے رہ گئے

طالب وہ میرے باغِ تمنا کے پھول تھے
کھلنے بھی جو نہ پائے کہ مرجھا کے رہ گئے

غزل

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب

اس جام میں کیفِ مئے گلفامِ غزل ہے — یہ نرگسِ مخمور ہے یا جامِ غزل ہے
مکھڑے کا اجالا ہے کہ تفسیرِ معانی — پلکوں کی یہ لرزش ہے کہ ابہامِ غزل ہے
کہتی ہے انھیں دیکھ کے ہر صبحِ تمنا — زلفوں کی گھنی چھاؤں ہے یا شامِ غزل ہے

ہر نشترِ پنہاں میں ہے اک کیفِ دل افروز ۔ شاید کہ محبت مری انجامِ غزل ہے

مضرابِ نفس اور یہ سازِ دلِ مجروح ۔ ہر ضرب باندازۂ پیغامِ غزل ہے

نازاں ہے بہت اپنی فغانِ سحری پر ۔ میرا دلِ برباد کہ خوش کامِ غزل ہے

وہ دل میں سمائے تو محبت نے صدا دی ۔ یہ پیکرِ زیبا نہیں، اتمامِ غزل ہے

شانوں پہ یونہی رہنے دو زلفوں کو پریشاں ۔ یہ ایک عجب سلسلۂ دامِ غزل ہے

پچھلا پہر، ڈوبتے تاروں کی یہ جھلمل! ۔ شاعر کے لیے جلوۂ الہامِ غزل ہے

حرمت کو بتاؤ کہ یہ ہے فیصلۂ شوق

ان ہونٹوں کی جنبش نہیں انعامِ غزل ہے

غزل

از جناب قمر سنبھلی

اسی زمیں پہ عطر بیز کارواں گزر گئے ۔ جدھر جدھر سے وہ گئے جہاں جہاں گذر گئے

نہ ڈگمگا سکے قدم کہیں بھی راہِ شوق میں ۔ ہزاروں سر سے آفتوں کے آسمان گزر گئے

تری حسین منزلیں نہیں ملیں تو کیا ہوا ۔ قدم قدم پہ ہم تو چھوڑتے نشاں گزر گئے

وہی ہے دوریٔ حبیب وہی ہیں دھڑکنیں ۔ خوشا وہ دن جو کامران و شادماں گزر گئے

ہوئے جو ہم رہِ طلب کی مشکلوں سے بے نیاز ۔ وفورِ شوقِ دید میں رواں دواں گزر گئے

نگاہِ دلنشیں سے تم نے دیکھا جب بھی میری سمت ۔ دلِ حزیں سے لاکھوں غم کے کارواں گزر گئے

وہ گردِ کارواں بنے قمر جو خام کار تھے

جوان جن کے عزم تھے وہ کامراں گزر گئے

مطبوعات جدیدہ

کربل کتھا ۔ از فضل علی فضلی، ترتیب مالک رام صاحب و مختار الدین آرزو صاحب،

صفحات ۳۴۸، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ، قیمت قسم اعلیٰ …

ملا حسین واعظ کاشفی متوفی ۹۱۰ھ اپنی تفسیر اور خاص طور پر اپنی دو فارسی کتابوں اخلاق محسنی اور انوار سہیلی کی وجہ سے ایران اور ہندوستان میں مشہور ہیں، انھوں نے شہدائے کربلا کے واقعات پر ایک کتاب روضۃ الشہداء لکھی تھی، جو کئی سو برس تک ایران، ترکی اور ہندوستان میں مقبول تھی، اس کتاب کی مقبولیت کی وجہ سے اس انداز پر کئی اور کتابیں لکھی گئیں، اور مختلف زبانوں میں اس کے خلاصے اور ترجمے بھی کیے گئے، خود ہندوستان میں فارسی اور اردو نظم و نثر میں اس کے کئی خلاصے ہوئے ہیں، انہی خلاصوں میں ایک فارسی خلاصہ وہ تھا جسے فضلی نواب مشرف علی خاں کے گھر میں سنایا کرتے تھے، اس خلاصے کے بارے میں تحقیق نہیں ہو سکی کہ کس نے کیا تھا، بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود کاشفی ہی نے اس کا خلاصہ کیا تھا، فضلی نے لکھا ہے کہ اس خلاصہ کی زبان چونکہ فارسی تھی، جو عورتوں اور بچوں کو اتنا متاثر نہیں کرتی تھی، جتنا کہ اپنی زبان متاثر کرتی ہے، اس لیے انھوں نے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا، مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلاصہ روضۃ الشہداء کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ آزاد ترجمہ ہے، اس کتاب کا نام بعض تذکرہ نگاروں نے "دہ مجلس" بتایا ہے، مگر کتاب کے مقدمہ میں خود فضلی نے اس کا نام

کر بل کتھا لکھا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف اردو زبان کی قدیم میٹھی بولی کا ایک اور قیمتی نمونہ سامنے آگیا، بلکہ اس سے اردو نثر میں تصنیفات کے آغاز کی تاریخ کا رشتہ بارہویں صدی کی ابتدا تک پہنچ گیا، اور اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو نثر کی یہ پہلی نہیں تو دوسری کتاب ضرور قرار پاتی ہے، مرتبین نے شروع کتاب میں ۴۰ - ۴۵ صفحے کا ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، جو بجائے خود ایک خاصے کی چیز ہے، اس کتاب کی اشاعت پر مرتبین کتاب کے ساتھ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ بھی قابل صد مبارک باد ہے،

افریقہ ایک چیلنج ۔ از احمد عبد اللہ المسدوسی، صفحات ۱۳، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مکتبہ خدام ملت، کراچی قیمت عہ

یوں تو وسطی ایشیا جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ سبھی ممالک اسلامی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، مگر خاص طور پر افریقہ وہ واحد براعظم ہے، جسے مسلمانوں کا براعظم کہا جا سکتا ہے، نیز وہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں عیسائیت مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے ناکام ہوئی ہے، حالانکہ ایشیا کے مقابلہ میں وہاں مغرب کی استعماریت اور اس کے سایہ میں عیسائیت کی دعوت و تبلیغ کی تاریخ بہت پرانی ہے، احمد عبد اللہ المسدوسی صاحب نے جن کو اس موضوع سے خاص دلچسپی ہے، اور جو اس سے پہلے مذاہب عالم اور دوسری کتابیں لکھکر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، اس کتاب میں افریقہ کا سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور جغرافیائی جائزہ لیکر اس چیلنج کی طرف اشارہ کیا ہے، جو مغرب کی طرف سے سیاسی اور مذہبی سطح سے دیا جا رہا ہے، اسلام کا مستقبل افریقہ میں بہت شاندار بن سکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان حزم و احتیاط کے ساتھ اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں، اقوام متحدہ کی ⅓ تعداد زیادہ تر افریقہ کے ملکوں سے پوری ہو جاتی ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے،

کتاب نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی بڑی پر معلومات اور اردو داں طبقہ کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے۔

انوار نظر ۔ از نظر لکھنوی، مرتبہ شیش چند طالب دہلوی، صفحات ۱۴۷، کتابت و طباعت بہتر، پتہ شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، دہلی، قیمت ﷼

منشی نوبت رائے نظر (م ۱۹۲۳ء) لکھنؤ کے آخری دور کے ممتاز شاعروں اور نثر نگاروں میں ہیں، ہندوستان کے متعدد مشہور رسالوں اور اخباروں کے وہ اڈیٹر رہ چکے ہیں، زمانہ، ادیب، آزاد، اودھ پنچ وغیرہ کے صفحات ان کے رشحات قلم سے برسوں مزین رہ چکے ہیں، معرکۂ شرر و چکبست میں بھی وہ حصہ لے چکے ہیں، نقاد لکھنوی کے نام سے جتنے مضمون بھی نکلتے تھے وہ سب انہی کے قلم سے ہوتے تھے، حسرت موہانی مرحوم ان کے بڑے قدر دانوں میں تھے، انھوں نے ان کی نظم و نثر کو بہت سراہا ہے، انوار نظر ان کی غزلوں اور کچھ نظموں کا مجموعہ ہے، ان کی غزلوں میں قدیم و جدید تغزل کا اچھا امتزاج ہوتا ہے، لکھنویت کے عیوب سے ان کا کلام بڑی حد تک پاک ہے، روانی، برجستگی اور معنویت سے کم ہی شعر خالی ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں

یا دل ہے مرا یا نقش کف پا ہے	غل ہے کہ ایک آئینہ سرِ راہ پڑا ہے
حالتِ عشرتِ محفل ہے رقم سب اسی میں	ایک دفتر کے برابر پر پروانہ ہے
دل مئے عشق سے کتنا ہی لبالب ہو نظر	جب چھلک جائے تنک ظرفیٔ پیمانہ ہے

امید ہے کہ اہل ذوق میں ان کا کلام شوق سے پڑھا جائے گا۔

دیوان فائز ۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ فضل امام صاحب، صفحات ۱۱۴، کتابت و طباعت متوسط ناشر دار الادب بہارستان، پٹنہ ۶، قیمت صر

یہ سید شاہ نذیر الحق فائز مرحوم کی فارسی غزلیات کا مجموعہ ہے، فائز کو شاعری کا فطری

ذوق تھا، اور اسی ذوق کی تسکین کی خاطر شاعری کرتے تھے، ان کا ایک فارسی دیوان شائع ہوگیا، یہ دوسرا دیوان ہے، اس میں ان کی غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ تو نہیں ہے، مگر اکثر ان میں انتخاب ہیں، فارسی زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت ہے، اور کم از کم متوسطین شعرائے فارسی کا رنگ ان کے کلام میں ضرور موجود ہے، انھوں نے حافظ و صائب کی بعض مشہور غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، اور اس کو نباہا ہے، "اس عہد" دور میں اس مجموعہ کے زیادہ مقبول ہونے کی توقع تو نہیں ہے، مگر اہل نظر میں ضرور یہ پسند کیا جائے گا۔

آسان بنگلا تعلیم۔ از وحید قیصر ندوی، صفحات ۱۳۰، ٹائپ عمدہ،
پتہ مکتبہ العرفان سی ۸/۴ ایوب ایونیو، محمد پور ڈھاکہ ۷

پاکستان کے ایک حصہ کی زبان بنگلا ہے، اسی طرح ہندوستان کی کئی کروڑ کی آبادی یہ زبان بولتی ہے، اردو داں طبقہ بنگلا زبان میں بات چیت تو آسانی سے کر لیتا ہے، مگر لکھنے پڑھنے میں وہ دشواری محسوس کرتا ہے، وحید قیصر صاحب ندوی نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے، انھوں نے پوری کوشش کی ہے، کہ کم سے کم وقت میں اردو جاننے والے اور خاص طور پر مغربی پاکستان کے لوگ بنگلا زبان سیکھ جائیں، اس لیے کہ اس سے پاکستان کے ایک دوسرے حصہ میں یکجہتی کی فضا پیدا ہونے میں بڑی مدد ملے گی، ایک سرسری مطالعہ سے ان کی یہ کوشش کامیاب نظر آتی ہے۔